January 1939

عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوعِ اسلام

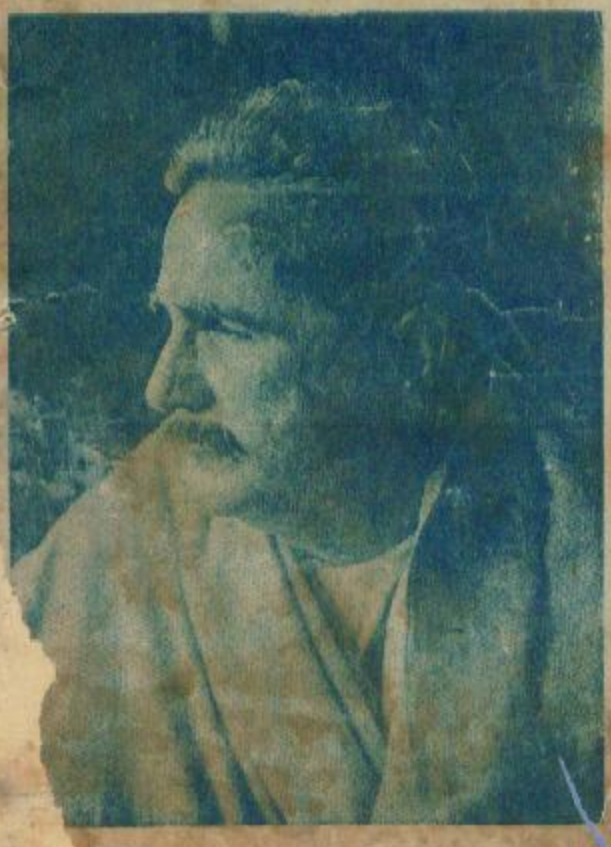

یہ تصویر رسالہ سب رس حیدرآباد دکن سے دستیاب ہ

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتّب
محمد عثمان

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
فی پرچہ ۸؍

جلد (۲) شمارہ ۹ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ بابتہ ماہ جنوری ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

۱	متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب	رازی	۱-۶۱
۲	افکارِ عالیہ	علامہ اقبالؒ	۲-۶۴
۳	لامرکزیت (نظم)	مولانا اسلم صاحب جیراجپوری	۶۵
۴	پیام اقبال اور قرآن کریم	جناب مولانا غلام احمد صاحب پرویز بی اے	۶۶-۷۰
۵	وقت نماز	جناب اسد صاحب ملتانی	۷۱
۶	بصائر	ادارہ	۷۲-۷۶
۷	تفسیر اسرار خودی	از خان محمد سلیم خاں چشتی	۷۷-۸۳
۸	ارمغان حجاز	ل- ج	۸۳-۸۶
۹	ادارۂ معارفِ اسلامیہ کا تیسرا سالانہ جلسہ	ادارہ	۸۷-۹۰
۱۰	لمعات	،،	۹۱-۹۵

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

(رازی)

ہندوستان کی سیاستِ حاضرہ میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نظریۂ قومیت ہے یہی منحوس دوراہہ ہے جہاں پہنچکر ملتِ اسلامیہ کے افراد ایک دوسرے کو ہدفِ افتراق بنا بنا کر الگ الگ جماعتوں میں تقسیم ہو رہے ہیں اور پھر یوں ایک دوسرے سے منہ موڑتے ہیں کہ گویا ان میں کبھی کوئی چیز وجہِ جامعیت تھی ہی نہیں۔ یہی وہ بدبخت چٹان ہے جس سے ٹکرا کر امتِ مسلمہ کی کشتی پاش پاش ہو چکی ہے اور اسکے منتشر تختے مختلف موجوں کے ساتھ اس بیکسی کے عالم میں بہے جا رہے ہیں جیسے گنگا میں لاشیں تیر رہی ہوں۔ قوم کی اجتماعیت فنا ہو چکی ہے انکی متحدہ قوتیں باہمی تخریب و استہلاک میں صرف ہو رہی ہیں مسلمان کا گلا مسلمان کے ہاتھوں کٹ رہا ہے۔ اور دوسری طرف وہ قوم جسنے استادانِ سبا سے سیکھا ہے کہ کسی قوم کو تباہ و برباد کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ان میں باہمی تفرقہ پیدا کر دو۔ نہایت اطمینان سے مسلمانوں کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر۔ اپنی آنیوالی حکومت کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

سالِ گذشتہ کے آغاز میں اس نظریہ سے متعلق ایک نہایت اہم بحث کا سلسلہ چھڑا تھا۔ مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ "اس زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں"۔ چونکہ یہ نظریہ اسلام کے شجرِ طیب کی جڑ و بیخ پر تبر چلانے کے مرادف تھا اسلئے ملتِ اسلامیہ کے قلبِ حساس میں اس سے ایک ٹیس پیدا ہوئی اور آہ و افغاں کی شکل میں ان الفاظ میں لب تک آپہونچی کہ:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است ! چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است (اقبال)

ملت کا نصیبہ یاوری کرتا تو مولانا صاحب حضرت علامہؒ کے انہی اشارات سے متنبہ ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ ان کو جرأت عطا کر دیتا تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف بھی فرما لیتے کہ کون سا انسان ہے جسے معصوم عن الخطاء ہونیکا دعوےٰ ہو سکتا ہے لیکن ہماری شوربدہ بختی کہ ایسا نہ ہوا اور مولانا صاحب نے اعتراف حقیقت کے بجائے "عذر گناہ" کا مسلک اختیار فرما لیا اور اپنے نظریہ کی تائید میں ایک مبسوط بیان شائع کر دیا جس میں سب سے پہلے یہ فرمایا کہ میں نے اپنی تقریر میں قوم کا لفظ استعمال کیا تھا اور حضرت علامہؒ نے اپنے شعر میں اسے لفظ ملت سے تعبیر کیا ہے جو عربی میں قوم کے لیے نہیں۔ بلکہ دین اور شریعت کے لیے مستعمل ہے۔ اس لیے حضرت علامہؒ کا الزام غلط ہے اور اسکے بعد اپنے نظریہ کی توضیح ان الفاظ میں فرمائی۔

(۱) موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل و مذہب سے۔

(۲) قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت ہو۔ خواہ وہ مذہب ہو یا وطنیت یا نسل یا پیشہ یا رنگت یا کوئی اور صفت معنوی یا مادی وغیرہ۔

(۳) یہ دعوےٰ کہ اسلام کی تعلیم قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرف انسانی اور اخوت بشری پر رکھتی ہے مجھے معلوم نہیں کہ کون سی نص قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔ (مدینہ مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء)

جن خوش بخت حضرات کو حضرت علامہؒ کے قرب کی سعادت نصیب رہی انکا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت علامہؒ سے جب اس بیان کو پڑھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے اور کہتے تھے کہ یا الٰہ العالمین! اب ہندوستان میں تیرے اس پیغام ازلی کا کیا انجام ہونے والا ہے! جہاں کے مفتیان دین متین اور حامیان شرع مبین کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اس نظریہ کو اسلامی نظریہ قرار دے رہے ہیں جس باطل نظریہ کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا اور جب تک اسے عملاً فنا نہیں کر دیا گیا دین کی تکمیل اور اتمام نعمت کا اعلان نہیں ہوا۔ حضرت علامہؒ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دورے پڑ رہے تھے

لیکن مسئلہ کی اہمیت اتنی تھی کہ انہوں نے جان تک کی پرواہ نہیں کی۔ اور اس کے متعلق ایک نہایت بسیط اور جامع بیان اخبارات میں شائع فرما دیا۔ اور یوں اس مسلسل جہاد کی تکمیل فرما دی جس پہ اُن کی تمام زندگی صرف ہوئی تھی۔ وہ جواب اس قدر مسکت اور مستحکم تھا کہ مولانا صاحب کو کہنا پڑا کہ میرا مقصد ملّی کے بیان میں اخبار رتہا انشا نہ تھا "متحدہ قومیت اور اسلام" یعنی یہ کہ میں نے صرف یہ بتایا تھا کہ آجکل یورپ کا نظریہ یہ ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ تم بھی اپنی قومیت کی بنا جغرافیائی حدود قرار دے لو۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ انتقال فرما گئے۔ اور یوں اس بحث کا دروازہ بند ہو گیا لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد مولانا صاحب نے مرحوم کے آخری بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کرا دیا۔ جو اسوقت ہمارے زیر نظر ہے اس میں شبہ نہیں کہ نفسِ موضوع کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ مولانا صاحب اس سے متعلق پمفلٹ نہیں بلکہ ایک ضخیم کتاب شائع فرما دیتے۔ لیکن ہمیں افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ جس انداز سے یہ پمفلٹ لکھا گیا ہے وہ کچھ پسندیدہ نہیں ہے اس میں افہامِ حقیقت سے زیادہ زور حضرت علامہؒ کی تردید میں صرف کیا گیا ہے اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ غم و غصہ کے انتقامی جذبات ایک ایک صفحہ سے اُبلتے نظر آ رہے ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ اس تحریر کا محرک کون سا جذبہ تھا۔ انہیں شبہ نہیں کہ ایسے وقت میں جب اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ فریقِ ثانی موجود ہی نہیں ہے۔ جو کسی کے جی میں آئے کہہ ڈالے۔ اس سے کہنے والے کا کلیجہ تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ طرزِ عمل کس چیز کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں حضرت علامہؒ زندہ ہوتے تو ملتِ اسلامیہ کے سامنے۔ اس پمفلٹ کے جواب کے بہانہ سے قرآن کریم کے حقائق و معارف کا ایک اور باب کھل جاتا۔ اب اُن کی جگہ لینے والا کون ہے لیکن مولانا صاحب کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ۔

اگرچہ میکدہ سے اٹھ کے چل دیا ساقی!
وہ مے۔ وہ خُم۔ وہ صراحی وہ جام باقی ہے

اور خم کدہ اقبال میں ایسے ایسے رندان قدح خوار موجود ہیں جو ساقی کی چشم مست کے صدقے شراب ہندی اور بادہ حجازی میں ایک نگاہ میں تمیز کر کے بتا دیں۔ طلوع اسلام۔ جسے پیام اقبال کی نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں متحدہ قومیت کے نظریہ کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے تاکہ وہ سعید روحیں جو تلاش حقیقت میں مضطرب و بیتاب رہتی ہیں۔ کسی صحیح نتیجہ پر پہونچکر سامان تسکین حاصل کریں وما توفیقی الا باللہ۔

طرز استدلال

آپنے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ ہمارے قومیت پرست حضرات اپنے دعاوی کی تائید میں ایک عجیب حربہ سے کام لیتے ہیں۔ جب کبھی ایسا ہو کہ وہ چاروں طرف سے گھر جائیں۔ کوئی راہ مفر نظر نہ آئے۔ جواب بن نہ پڑے۔ دلائل عاجز آ جائیں۔ تو اسوقت اُنکے ترکش کا آخری تیر نکلتا ہے اور وہ فریق مقابل سے نہایت جرأت دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ تم برطانیہ پرست ہو۔ سامراج کے حامی ہو۔ انگریز کے پٹھو ہو۔ رجعت پسند ہو۔ ٹوڈی ہو۔ آزادی کے دشمن ہو اور اسکا اس زور سے ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ اصل موضوع اس شور میں گم ہو کے رہ جاتا ہے ہمارا خیال تھا کہ ان اوچھے ہتھیاروں پر عام سطح کے لوگ ہی اُترتے ہونگے لیکن ہمیں یہ دیکھکر بیحد تاسف ہوا کہ مولانا صاحب نے بھی اس باب میں اسی حربہ سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جن اخبارات نے آپکے پہلے بیان کی مخالفت کی تھی۔ انکے متعلق ارشاد ہے۔

"اگرچہ بہ حیثیت واقعہ بہت سے اشخاص سے غلط فہمی کا ازالہ ہو چکا ہے۔ اور ان برطانیہ پرست اخباروں کی افترا پردازی اور جھوٹے پروپگنڈے کا پردہ اٹھ گیا ہے"۔

(متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ)

ذرا آگے بڑھ کر تحریر فرماتے ہیں:۔

"برطانیہ کے ازلی وفاداروں کو کب ایسی بات کا تحمل ہو سکتا تھا" (ایضاً صفحہ)

اپنے اس رسالہ کے متعلق یوں پیش بندی کرتے ہیں کہ:۔

"اگرچہ بہت سے ان لوگوں سے جنکو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جنکے دماغ اور قلب طالی مدبرین کے سحر سے ماؤف ہو چکے ہیں۔ اُمید نہیں کہ وہ اسکو قبول کرینگے۔" (ایضاً ص۲)

جن حضرات کی نگاہیں نفسیات انسانی پر ہیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی پیش بندیوں کی ضرورت کب اور کیوں لاحق ہوا کرتی ہے، یہ ابتدا میں لکھا اور آخیر میں جا کر اسے پھر دہرا دیا کہ:۔

"جو لوگ مسلمانوں کو اس میدانِ سیاست میں اُترنے سے روک رہے تھے اور متحدہ قومیت کو بھیانک صورتیں ظاہر کرکے نفرت دلا رہے ہیں، بلاشک و شبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات انجام دے رہے ہیں جو اسکی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں"

(متحدہ قومیت اور اسلام ص۲۶)

یہاں تک بھی خیر تھی۔ لیکن — درازدستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں — کہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور — سنیئے اور داد دیجئے کہ — خود حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ۔

"یہ امر یقینی اور غیر قابلِ انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ اور ان کے کمالات بھی غیر معمولی تھے وہ آسمان حکمت و فلسفہ شعر و سخن تحریر و تقریر دل و دماغ اور دیگر کمالات علمیہ و عملیہ کے درخشندہ آفتاب تھے۔ مگر باوجود کمالاتِ گوناگوں ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا۔ اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں" (ایضاً ص۷)

یہ مطلع تھا۔ مقطع ملاحظہ فرمائیے:۔

"غرضیکہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگزاریوں سے سرسید جیسے تجربہ کار عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالٹکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا۔ اور اسی کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاسیات سے علیحدہ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنا دیا پھر اگر ڈاکٹر اقبال مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے۔" (ایضاً ص۵۲)

غالب کو کسی مخالف نے ماں کی گالی دی تو آپ نے کہا تھا کہ ان بدمذاق۔ کم ذوق لوگوں کو گالی دینے کا

سلیقہ بھی نہیں آتا۔ غالب شاعر تھا۔ جس لیئے اُس نے اس چیز کو کور ذوقی پر محمول کیا لیکن اس کور ذوقی کا اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب آدمی کے اعصاب پر انتقامی جذبات کا بھوت سوار ہو جائے تو اس کا عقلی توازن قائم نہیں رہتا اور اسکے لبوں سے خود معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں ورنہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت علامہؒ کے متعلق اور جو کچھ جی میں آئے کہہ لیجئے۔ شاید کوئی نہ کوئی ایسا مل جائے جو سے باور کرلے لیکن انکے متعلق یہ کہنا کہ وہ سحر برطانیہ سے مسحور ہو چکے تھے ایک ایسا الزام ہے جسے تسلیم کرنے کے لیئے کوئی صحیح الدماغ آدمی تیار نہیں ملے گا۔ اس لیئے کہ جو شخص اقبالؒ سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ان کی تمام زندگی سحرِ برطانیہ اور افسونِ افرنگ کے خلاف ایک مسلسل جہاد تھی۔ اور ان کی زندگی کا یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس کا اعتراف خود انکے مخالفین تک کو تھا۔ آنکے کلام پر اگر کوئی صاحب نظر دو لفظوں میں تبصرہ کرنا چاہے تو بلا تکلف کہہ سکتا ہے کہ وہ

فریاد ز افــرنگ و دلآویزی افــرنگ

کی افسون شکن تشریح ہے۔ وہ اقبالؒ جس کی تمام عمر یہ کہتے کہتے گزر گئی کہ:۔

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر ÷ فتنہ ہا در آستینِ او نگر ÷
از فریبِ او اگر خواہی اماں ÷ اشترانش را ز حوضِ خود براں ÷

وہ جسنے "کفن دزدانِ یورپ" کی انسانیت سوز و سیہ کاریوں کے خلاف ایک مسلسل صدائے احتجاج ان الفاظ میں بلند کی ہو کہ۔

آدمیت زار نالید از فرنگ ÷ زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ ÷

وہ جو ان کے متعلق اس نتیجہ پر پہونچ چکا ہو کہ۔

جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت

اور اس لیئے ایک صدائے ربانی بنکر آخری سانس تک یہی تلقین کرتا رہا ہو کہ۔

مومنِ خود۔ کافرِ افرنگ شو[1]

---

[1] حضرت علامہؒ کے کلام سے اس عنوان پر اگر تمام اشعار جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ (بقیہ حاشیہ

دوسرے صفحہ پر)

اس "اقبالؒ" کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "ساحرین برطانیہ" کے جادو سے مسحور ہو چکا تھا یا تو بقول غالب اپنی انتہائی بدمذاقی کا ثبوت دینا ہے یا مغلوب الغضب ہونے کا اعلان کرنا ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں بالعموم۔ اور اس طبقہ میں بالخصوص جو انگریزی خواں نہیں ہے سحرِ یورپ کے خلاف جس قدر بغاوت اور تنافر کے جذبات پائے جاتے ہیں بہ رہینِ منت ہیں۔ اسی مردِ حق آگاہؒ کی سعیِ پیہم کے کس قدر ظلم ہے کہ بجائے اسکے کہ مولانا صاحب انگریزی نہ جاننے والے طبقہ کے نمایندہ کی حیثیت سے حضرت علامہؒ کے اس احسان کے لیئے اظہارِ شکر فرماتے۔ وہ ان کے خلاف اس حربہ کو لے کر میدان میں آ تمآئے جس کی زد اچٹ کر خود اپنے ہی اوپر آ پڑے کہ:۔

"تا مرد سخن نگفتہ باشد   عیب و ہنرش نہفتہ باشد"

اگر حضرت علامہؒ کے خلاف عوام کو بھڑکانا ہی مقصود تھا تو اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا کہ انکا فوٹو دیکھ لو ڈاڑھی کہاں ہے؟

اور پھر آپنے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ یہ سحرِ برطانیہ کا طعنہ دیا کس موقع پر جاتا ہے؟ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ "آجکل قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں" حضرت علامہؒ کا ارشاد ہے کہ یہ نظریہ کہ قومیت کی بنا وطنیت پر ہے ساحرین یورپ کا پیدا کردہ ہے۔ اسلام مسلم قومیت کی بنا خالص ایمان پر رکھتا ہے لہذا اسلام کا نظریۂ قومیت۔ یورپ کے نظریۂ قومیت کے بالکل خلاف ہے۔ اسکے جواب میں مولانا صاحب کا فتویٰ ہے کہ اقبالؒ ساحرین یورپ کے دامِ تزویر میں گرفتار رہتا۔

یعنی

جو شخص یورپ کے ایجاد کردہ نظریہ کی تائید کرے وہ تو رئیس الاحرار ہے۔ اسپر سحرِ یورپ کا کوئی اثر نہیں

اور

جو شخص اسکی مخالفت کرے اور یہ بتلائے کہ یہ سحرِ یورپ ہے اس سے بچ کر رہنا۔ وہ ساحرین یورپ کے سحر

(بقیہ حاشیہ) ایں حیہ بایدکرد کے مندرجہ صدر اشعار یونہی اسوقت ذہن میں آگئے ہیں۔ استیعاباً اسپر کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ شخص جس نے کلام اقبالؒ کو سرسری نظر سے بھی دیکھا ہے اُسے معلوم ہے کہ طلسمِ فرنگ کی انہوں نے کس حد تک نقاب کشائی کی ہے ۱۲

میں گرفتار ہے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ان حضرات کے نزدیک سحر برطانیہ سے تو وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو کفر و اسلام کے امتزاج سے ہندوستان میں ایک "متحدہ قومیت" کی تشکیل کی حمایت کرے۔ اپنی کوئی رائے نہ رکھے۔ بلکہ کانگرس کی پاس کردہ تجاویز کے لیے آلہ مکبر الصوت (Loud Speaker) کا کام دے۔ کانگرسی ائمہ سیاست کی اقتدا میں "جزئیت امام" کی سومیری کہہ کر انکی آواز پر اٹھتا اور جھکتا چلا جائے۔ انہی کے ملّا کے فتاوے کے نیچے "الجواب صحیح" لکھ کر مہر تصدیق ثبت کردے۔ اور جو ایسا نہ کرے۔ اسکے متعلق اعلان کردے کہ اُسے انسان کہلانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

وہی جذبہ انانیت و خود پرستی جو کبھی اپنے آپ کو نحن ابناء اللّٰہ (اللہ کی چہیتی اولاد) اور دوسروں کو لیسوا علی شیء (عقل و بصیرت سے عاری) سمجھنے پر آمادہ کرتا تھا۔ جو اس دعوی کا محرک ہوتا تھا کہ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودًا او نصاریٰ (جنت میں وہی جاسکے گا جو ہمارے مسلک کی تائید کریگا) آج وہی جذبہ اپنے آپکو رئیس الاحرار اور باقی مسلمانوں کو ذلیل و خوار غلام سمجھنے کا محرک بن رہا ہے۔ روح وہی کارفرما ہے جو اقوام سابقہ کے احبار و رہبان میں ہنگامہ خیز تھی۔ صرف قالب میں فرق ہے۔

بدلکے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں   اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

اقبالؒ

تضاد بیانات

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ مولانا صاحب نے حضرت علامہؒ کی زندگی میں اپنی غلطی کو اس نقاب میں چھپانے کی کوشش کی تھی کہ دہلی کی تقریر سے اُنکا مطلب صرف اس قدر بیان کرنا تھا کہ آجکل یورپ میں قومیت کے متعلق اس قسم کا نظریہ قائم ہوچکا ہے۔ اس سے مفہوم یہ مشورہ دینا نہیں تھا کہ مسلمان بھی اپنی قومیت کی تشکیل انہی خطوط پر کریں۔ اسکا اعتراف خود رسالہ زیر نظر میں بھی موجود ہے۔ جہاں فرماتے ہیں:-

جس طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم کو میرے بعض احباب کے خطوط کے جواب سے معلوم ہوا۔
دہلی کی تقریر میں مشورہ دینا مقصود نہ تھا اور نہ کوئی لفظ اس کا ذکر کیا گیا تھا؟

(متحدہ قومیت اور اسلام)

لیکن اب مولانا صاحب نہ صرف اس نظریہ کا مشورہ ہی دیتے ہیں بلکہ اسے قرآن کریم سے ثابت کرکے بطور مذہبی فریضہ کے پیش کرنے کی کوشش فرماتے ہیں اور (معاذ اللہ) اسے خود نبی اکرم کی طرف منسوب کرکے مسلمانوں کو اس اسوۂ حسنہ کیطرف دعوت دیتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے لیے اپنے ضائع شدہ حقوق حاصل کرنیکا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں

"ایسے مقاصد کے لیے متحدہ قومیت غیر مسلموں کے ساتھ بنانا خود جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہے۔" (ایضاً ص۱۴)

اور اس کی اس تشارت سے تائید فرماتے ہیں کہ:۔

"بنابریں متحدہ قومیت کا جذبہ جو کہ ان مختلف مذاہب ہندیہ میں بجز وطنیت اور کسی ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا، پیدا ہونا اور نہایت قوت کے ساتھ پیدا ہونا ازبس ضروری ہے"

(متحدہ قومیت اور اسلام ص۱۲)

معلوم نہیں کہ جس مسئلہ کو حضرت علامہ کی زندگی میں محض اخبار (خبریہ) کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا اب کون سے مصالح سامنے آگئے کہ اسے انشا کی حیثیت دی جارہی ہے اور مسلمانوں کے دین اور دنیا کا تحفظ اسی کے اندر بتایا جارہا ہے اسمیں شبہ نہیں کہ سیاسی معاملات میں عوام کا حافظہ کمزور ہوا کرتا ہے لیکن اتنا بھی کمزور نہیں جتنا مولانا صاحب خیال فرمارہے ہیں

لغوی بحث

مولانا صاحب نے فروری ۱۹۳۸ء میں جو بیان شائع فرمایا تھا اسمیں تمام قوت اس بات کے ثابت کردینے میں صرف فرمادی تھی کہ میں نے "قوم" کا لفظ استعمال کیا تھا اور حضرت علامہ نے اپنے شعر میں

لفظ ملت لکھا ہے جو قوم کے لفظ سے بالکل جداگانہ مفہوم پر دلالت کرتا ہے ہم نے اپنے مضمون نظریہ قومیت مطبوعہ طلوع اسلام بابت مئی سنہ ۱۹۳۸ء میں عرض کیا تھا کہ ایک ایسے اہم مسئلہ کو لغوی بحث کے لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا کر یہ سمجھ لینا کہ ہم نے اپنے دعوے کو نہایت محکم دلائل سے ثابت کر دیا ہے اپنے آپکو دھوکہ دینا اور قوم پر ظلم کرنا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ متحدہ قومیت کا تصور از روئے اسلام جائز ہے یا نہیں ؟۔
اس سوال کو اس بحث سے کیا تعلق کہ لفظ "ملت" بمعنی قوم استعمال ہوتا ہے یا نہیں ؟ رسالہ زیر نظر جب ہمارے سامنے آیا تو چونکہ اسکا عنوان تھا "متحدہ قومیت اور اسلام" ہمیں خوشی ہوئی کہ مولانا صاحب جیسے عالم متبحر نے اسے اسلامی نقطہ نگاہ سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہوگی لیکن ہماری مسرت بہت جلد مبدل بہ یاس ہوگئی جب ہم نے دیکھا کہ مولانا صاحب نے ایک نہیں دو نہیں بیس بائیس صفحات بھر اس تحقیق انیق کی نذر کر دیئے ہیں کہ قوم کے معنی ملت کے معنوں سے مختلف ہیں اور اس لئے بڑی بڑی بوجھل عربی لغت کی کتابوں مثلاً مختار الصحاح۔ قاموس۔ تاج العروس۔ مجمع البحار۔ المنجد وغیرہ کے حوالوں سے اپنے دعوے کی تائید فرمائی ہے ہم تو اس چیز کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ نفس موضوع کو بالآخر اس لغوی بحث سے تعلق کیا ہے یا تو مولانا صاحب خود ہی یہ نہیں سمجھ سکے کہ مسئلہ متنازعہ فیہ کیا ہے اور یا وہ دانستہ فریق مقابل کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کے بوجھ سے ڈرانا چاہتے ہیں۔ اس اسلوب مباحثہ سے ہمیں ایک مناظرہ کا قصہ یاد آگیا ایک مولوی صاحب تھے فن مناظرہ میں طاق لیکن نحو سے بالکل کورے۔ فریق مقابل ایک پڑھے لکھے فارغ التحصیل طالب العلم تھے۔ اول الذکر مولوی صاحب کو فکر دامنگیر ہوئی کہ نفس موضوع پر بات چھڑ گئی تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائیگا۔ اس لئے انہوں نے بساط مناظرہ پر شاطرانہ چال سے کام لینے کی ٹھانی۔ اٹھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب سب سے پہلے یہ فرمایئے کہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کلمہ ہے یا نہیں۔ مولوی صاحب کے دماغ میں بیچارے صرف و نحو چکر لگا رہی تھی۔ وہ اس نحوی غلطی کے کس طرح مرتکب ہو سکتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں! یہ کلمہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الکلمۃ لفظ مفرداً کلمہ لفظ مفرد کو کہتے ہیں۔ مناظر مولوی صاحب نے بلند آواز سے کہا کہ لو بھائی مسلمانو! جو شخص مسلمانوں کے کلمہ کو کلمہ ہی نہیں مانتا اس سے ہماری بحث کیا ہو سکتی

ہے مسلمانوں کی باہمی بحث تو ان سے ہو سکتی ہے جنکا کلمہ ایک ہو۔ عوام کی جانب کہ نحوی مولوی صاحب نے کیا کہا۔ انہوں نے اتنا ہی سمجھا کہ یہ تو واقعی کلمہ کا بھی قائل نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسکے بعد کیا ہوا ہوگا"۔

قوم و ملت کے لغوی گورکھ دھندے سے کچھ اسی نہج کی بحث مولانا صاحب چھیڑ دیتے ہیں اور آپ یہ سنکر انگشت بدنداں رہ جائینگے کہ خود مولانا صاحب کو اِس امر کا اعتراف ہے کہ حضرتِ علامہؒ نے ملت کا لفظ قوم ہی کے معنوں میں استعمال کیا تھا چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"مگر دوسری حیثیت سے کہ جناب ڈاکٹر صاحب مسلمانانِ ہند کو قومیت متحدہ کا مشورہ دینا خلاف دیانت سمجھتے ہیں۔ اور یہ امر میرے نزدیک صحیح نہیں ہے"۔ (متحدہ قومیت اور اسلام ۳)

اب آپ خود اندازہ فرما لیجیے کہ مولانا صاحب کا اتنی طول طویل لغوی بحث سے مطلب کیا ہے۔ یہ تو ہوا خود انکا اعتراف۔ لیکن اگر بحث کا فیصلہ اس لغوی اعتبار سے ہی کرنا ہو تو وہ تو ایک فقرہ میں ہو سکتا ہے بے شک عربی میں قوم کے معنی جماعت اور گروہ کے ہیں اور ملت کے معنی شرع و دین کے لیکن حضرت علامہؒ نے اشعار مذکورہ صدر فارسی زبان میں لکھے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ فارسی میں ملت بمعنی جماعت اور گروہ آتا ہے یا نہیں؟ اسکے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں

"اور اگر غور کیا جائے تو متاخرین عرب اور فارسیوں اور ترکوں نے بھی لفظ ملت کو قوم کے معنی میں کہیں بھی استعمال نہیں کیا"۔ (متحدہ قومیت اور اسلام ص۳۱)

لیکن ہم نہایت ادب سے گزارش کرینگے کہ جہاں انھوں نے عربی کے اتنے اتنے ضخیم لغت کھنگالے تھے اگر فارسی کے ایک چھوٹے سے لغت مثلاً غیاث اللغات کی ورق گردانی کی تکلیف گوارا فرما لیتے تو انہیں نہایت آسانی سے نظر آجاتا کہ ملت کے معنی جماعت اور گروہ کے بھی لکھے ہیں۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

پھر یہ چیز بھی غور طلب ہے کہ مولانا صاحب نے "متحدہ قومیت" کے معانی متعین کرنے کا جو طریق

اختیار فرمایا ہے وہ اصولی طور پر غلط ہے۔ وہ پہلے لغت سے لفظ قوم کے معنی متعین فرماتے ہیں یعنی گروہ جماعت اور پھر لفظ متحدہ کے یعنی جن میں باہمی اتحاد ہو اور اسکے بعد جھٹ سے اس نتیجہ پر پہونچ جاتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے معنی ہیں "دو قوموں کا باہمی اتحاد کے رشتہ سے منسلک ہونا" اور اسکے بعد فتوی صادر فرما دیتے ہیں کہ کہئیے یہ کس طرح اسلام کے منافی ہے یہ ہے لے دے کے خلاصہ ان کی تمام لغوی بحث متعلقہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کا۔ اسی سے تو ہم سمجھے ہیں کہ مولانا صاحب پر غالباً ابھی تک یہ بھی واضح نہیں ہوا کہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ "متحدہ قومیت" یا (Nationalism) دَورِ حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے جسکے معانی دَورِ حاضرہ کی سیاسی روشنی میں ہی متعین کیے جا سکتے ہیں نہ کہ اُس زمانہ کے کتبِ لغت سے جن میں اِس اصطلاح کا کہیں ذکر تک نہ ہو۔ اِس طرح اصطلاحات کے معانی متعین کرنے سے تو اصلی مطلب کبھی سامنے نہیں آ سکتا۔ دَورِ حاضرہ کی مختلف سیاسی اصطلاحات کو لیجئے۔ مثلاً ترکِ موالات۔ عدم تشدد۔ مخلوط انتخاب۔ گول میز کانفرنس۔ بین الاقوامی وفاق (FEDERATION OF STATES) وغیرہ۔ اور اُن کے معانی پُرانی کتبِ لغت سے متعین کیجئے۔ پھر دیکھئے اصلی مطلب کس طرح خبط ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مصطلحاتِ مروجہ کے معانی ہمیشہ اُس زمانہ اور اُس ماحول کے ماتحت لینے پڑینگے جس میں کسی اصطلاح کا رواج ہُوا ہو۔ لہٰذا جب ہم "متحدہ قومیت" کو اسلام کی میزان سے تولنا چاہیں گے تو پہلے یہ متعین کرنا ضروری ہوگا کہ متحدہ قومیت سے مُراد کیا ہے۔ اسکے بعد دیکھیں گے کہ اسلام اسکے متعلق کیا کہتا ہے یہ ہے صحیح طریقہ کسی واضح نتیجہ تک پہنچنے کا۔ آئیے پہلے متحدہ قومیت کے معانی متعین کریں۔

باب دوم

متحدہ قومیت کا مفہوم

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں متحدہ قومیت (Nationalism) دورِ حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے جو بالخصوص ہندوستان میں فرقہ داری (Communalism) کے مقابلہ میں رائج کیگئی ہے اس اصطلاح کے معانی متعین کرنے کے لیے ہمیں ان سیاسی مدبرین کی تحریروں اور تقریروں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جنھوں نے اس اصطلاح کو رائج کیا ہے۔ مولانا صاحب نے خود فرمایا ہے کہ کانگرس نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۸۸۵ء میں اپنا پہلا اور ضروری مقصد حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا تھا۔

"ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کرکے ایک قوم بنانا۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۵۳)

لہٰذا متحدہ قومیت کے معنی کانگرسی حضرات کے اس بیان میں مل سکیں گے اور وہ بھی عصر حاضرہ کے کانگرسی حضرات سے کہ اس مسئلہ نے اتنی اہمیت حال ہی میں اختیار کی ہے پنڈت جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں۔

"ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا ہو۔"

(جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اس سے اتنا تو معلوم ہوگیا کہ جس متحدہ قومیت کا نقشہ کانگرس کے ذہن میں ہے وہ آج موجود نہیں ہے بلکہ وہ کوشش کرنے کے بعد پیدا ہوگی۔ آج مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندو الگ۔ اسلیئے یہ شکل متحدہ قومیت کی نہیں ہے متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی کیا ہونگے اسکی تفصیل ذیل کی سطور میں ملیگی

عنصر اول مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:۔

آج مسلمانوں کی الگ تہذیب ہے اور ہندوؤں کی الگ۔ ان دونوں تہذیبوں کے امتزاج

سے متحدہ قومیت کی تہذیب مرتب ہوگی؟" (ہریجن مورخہ ۲۹ بحوالہ اسٹیٹسمین)

اسکی تفسیر سوامی سمپورنانند۔ وزیر تعلیم یوپی، اِن الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اسکو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہونچاتا ہے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیز ہندوستان میں مفقود ہونی چاہیئے...... جب ہندو مسلم تہذیب مٹ جائیگی تب ہی ہندستانی تہذیب زندہ ہوسکے گی۔" (ٹربیون در مدینہ)

کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب اسکی تشریح میں یوں رطب اللسان ہیں:۔

"اسی اعتبار سے ہم آج ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اسی کی تمہید ہے" (الجمعیۃ۔ رجب ۱۳۵۶ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوگا ایسی تہذیب جو نہ مسلمانوں کی ہو، نہ ہندؤں کی۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب پیدا ہو۔

عنصر دوم آج مسلمانوں کا مذہب الگ ہے اور ہندؤں کا الگ، اسلیئے متحدہ قومیت ابھی وجود میں نہیں آسکتی اسکے لیئے ضروری ہے کہ دونوں مذاہب ملاکر ایک ایسا مذہب پیدا کیا جائے جو دونوں کا مشترکہ مذہب بن سکے، چنانچہ ڈاکٹر سید محمود صاحب، وزیر تعلیم صوبہ بہار اپنے ایک مضمون میں اکبر کے دینِ الٰہی کیطرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں:۔

"بعض نے اپنے ولولہ اور جوش سے مجبور ہوکر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیشِ نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشو و نما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جاسکتیں" (جامعہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء)

آنریبل مسٹر کے ایم منشی۔ ہوم منسٹر حکومت بمبئی نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا۔

"جس قدر رجحانات مذہب یا زبان یا ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل کی بنا پر قومیت کی

کے خلاف پیدا ہوتے ہیں۔ کانگریس ان رجحانات کی مخالفت میں ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ من حیث القوم ہماری کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی طرف سے ایک واہمہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ مذہب یا زبان کا رشتہ قومیت کے رشتہ کی جگہ وجۂ جامعیت ہو سکتا ہے۔ یہ ایک بڑا مُہلک دھوکا ہے۔ یاد رکھیے مذہب یا زبان کا رشتہ ہمیشہ قومیت کے بلند ترین رشتہ کے ماتحت رہنا چاہیے۔ یہ تصور ہی ہندوستان کو محکم اور آزاد بنا سکے گا۔" (نیشنل کال۔ ۲۰ ۹/۳۸)

ڈاکٹر بی۔ پتابھی سیتا رامیا۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کے ایک رُکن نے سُودیشی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا

"ہمارا معاشرتی نظام جو ہزاروں برس ہوئے وجود میں آیا تھا اسکی رُو سے افلاس کا ناطہ علم اور عظمت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا لیکن اب زندگی کی متضاد قوتوں میں توازن پیدا ہو چکا ہے۔ اشتراکیت (کمیونزم) اور اشتمالیت (سوشلزم) دورِ حاضرہ کے نظریۂ حیات ہیں۔ اور ہندوازم اور اسلام ازم عہدِ کہن کی یادگاریں ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم انکی بنیاد دوبارہ از سرِ نو استحکام کریں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۹ ۹/۳۸)

مذہب چونکہ متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر میں ایک سنگِ راہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ جب تک ایک متحدہ مذہب وجود میں نہ آئے مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دی جائے اور اسے سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے۔ چنانچہ کانگریس کے صدر مسٹر بوس نے آسام میں ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ "میں سب کچھ مسلمانوں کے حوالہ کر دینے کو تیار رہوں۔ بشرطیکہ وہ متحدہ قومیت کے نظریہ کو تسلیم کر لیں"۔ اسکی وضاحت میں ٹریبون نے اپنے ۱ر جون ۱۹۳۸ء کے پرچے کے افتتاحیہ میں لکھا۔

"بس اِس ایک شرط کے ماتحت طول و عرضِ ملک میں کوئی ایک کانگریسی بھی ایسا نہ ہوگا جو تمام اختیارات مسلمانوں کے حوالہ کر دینے پر آمادہ نہ ہو۔ انکے (یعنی کانگریسیوں کے) نزدیک یہ مسئلہ ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتا کہ کانگریس یا حکومت کے دائرہ میں نظامِ حکومت جسکے ہاتھ میں ہے وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ کیونکہ انکے نظریہ کی رُو سے مذہب

کو سیاسیات سے نہ کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی ہونا چاہیئے"۔

اور ایک مسلم قومیت پرست اسی نظریہ کو ان الفاظ میں دہراتا ہے :۔

"لیکن ان کا (مسلمانوں کا) باہمی اختلاف جو زیادہ تر مذہبی رجحانات کا نتیجہ ہے کبھی دور نہیں ہوسکتا اور اگر اسکے دور کرنے کی کوئی تدبیر ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کسی ایسے ادارے میں شریک ہوجائیں جو مذہبیات سے بالکل علیحدہ اور صرف سیاسیات سے تعلق رکھتا ہو اور ایسا ادارہ صرف کانگرس ہے"۔ (مدینہ ۱۳ اگست ۱۹۳۷ء)

ایک صاحب نے کہیں یہ اعتراض کیا کہ جواہر لال اور گاندھی مسلمانوں کے لیڈر کیسے ہوسکتے ہیں۔ اسکے جواب میں ایک ان کانگرسی مسلمان اخبار نے لکھا کہ۔

"اگر لیڈری سے مراد مسلمانوں کی دینی امامت و قیادت ہے تو یہ اعتراض درست ہے لیکن اگر اس سے مراد سیاسی رہنمائی ہے تو بے شک وہ قائد امام ہوسکتے ہیں" (زمزم ۲۴ جون ۱۹۳۷ء)

واردھا کی تعلیمی اسکیم کے متعلق جب اعتراض کیا گیا کہ اسمیں مذہبی تعلیم کا عنصر موجود نہیں۔ تو اسکے جواب میں کانگرس کا آرگن نیشنل ہیرلڈ اپنی ۱۱ دسمبر کی اشاعت میں لکھتا ہے :۔

"مذہبی تعصب کو یہ چیز فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اس ملک میں جہاں اتنے مختلف عقائد موجود ہیں۔ قومی تعلیم کو مفید بنانے کی یہی تجویز ہوسکتی ہے کہ اسے قرآن یا شاستروں کے قوانین اور احکام سے نہ لادا جائے"۔

متحدہ قومیت کے علمبردار ایک ایسے مذہب کو جو جماعتی زندگی سکھاتا ہو کس قدر خطرناک سمجھتے ہیں اسکا کچھ اندازہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے۔ وہ اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں یا دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا۔ بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ

حقوق اور مستقل حقوق کی بقا کا حامی ہے۔" (میری کہانی۔ صلا)

لہذا متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ مذہب اس قسم کا بنا دیا جائے جیسا دین الٰہی یا برہمو سماج۔ جس کی داغ بیل اکبر نے ڈالی تھی۔ اور جس کی تشریح مولانا آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں کی ہے اور جب تک ایسا مذہب تیار نہ ہوسکے اسوقت تک مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دی جائے جسے دنیاوی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔

عنصر سوم۔ آج مسلمان اپنا نام من حیث الجماعت الگ رکھتے ہیں اور ہندو الگ۔ یہ افتراق و اختلاف بھی متحدہ قومیت کی تعمیر میں سخت حائل ہے۔ لہذا قومیتِ متحدہ کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ قوم کا نام بھی ایک ہو۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب اپنے محولہ بالا مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:۔

لفظ ہندی کو زبان کے لیے نہیں بلکہ اہل ہند کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایسا ملک ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں صرف اسکا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ دار بنجاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کردیتا ہے کہ ہم اس ایشیائے اعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں اس لیے وقت آگیا ہے کہ ہم ایک مشترک نام اختیار کریں

یہ اسلیے کہ جیسا کہ ہم مسٹر کے۔ ایم۔ منشی کی تقریر کے اقتباس سے واضح کرچکے ہیں۔ وطنیت اور متحدہ قومیت کا رشتہ مذہب کے رشتے سے کہیں بلند و بالاتر ہے اسلیے نام کا انتساب بالاتر رشتہ کی بنا پر ہونا چاہیے لہذا متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے تیسری ضروری چیز یہ ہوئی کہ مسلمانوں کا اپنا الگ اسلامی نام بھی نہ رہے

عنصر چہارم۔ متحدہ قومیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس قوم کی زبان بھی ایک ہو۔ اسلیے کہ جب تک کسی قوم کی زبان مختلف ہوتی ہے وہ دوسری قوم کے اندر جذب نہیں ہوسکتی اور بغیر انجذاب و انضمام متحدہ قومیت کا وجود عمل میں نہیں آسکتا۔ الگ زبان کے وجود کے بقا کی تمنا کرنا فرقہ پرستی ہے جو قومیت پرستی کے بالکل متضاد جذبہ ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور ہے اور اس بنا پر زبان میں علیحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ اپنا اثر برابر دکھائے جا رہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشو و نما کے ساتھ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائیگی ایک علیحدگی پسند عامی زبان کو اوپر سے کھرچ تو دیکھو گے کہ وہ اندر سے فرقہ پرست ہے۔ بلکہ زیادہ تر تم اسے ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے"

عنصر پنجم۔ جب تک مسلمان اپنے مذہب کے پابند ہیں انکے باہمی معاملات کا تصفیہ از روئے کتاب و سنت صرف مسلمانوں کی جماعت۔ انکی اپنی مجلس شوریٰ اور اس مجلس کا امیر مرکز ملت۔ ہی کر سکتا ہے لیکن یہ اصول متحدہ قومیت کی تشکیل کے منافی ہے۔ متحدہ قومیت میں تمام معاملات کا فیصلہ ایک ایسی جمہوری حکومت کیطرف سے ہوگا جو تمام مختلف مذاہب کے مشترکہ مجموعہ پر مشتمل ہوگی۔ اور جمہوریت کے اصول کے مطابق اکثریت کا فیصلہ ملک کا قانون بنا کرے گا۔ اور اس جمہوریت کی بنا ہوگی۔ خالص وطنیت۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کانگرس پارٹی کے لیڈر فرماتے ہیں:۔

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کریں۔ اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کریں کہ ضمیر مذہب اور خدا کو انکے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم ہو سکتا ہے ..... عہد حاضر میں بہترین نظام حکومت کی بنا اس نظریے پر قائم ہو سکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں"

(ہندوستان ٹائمز۔ مورخہ $\frac{9}{38}$ ۵

یہ نظریہ ایک ہندو کا ہی نہیں بلکہ خود مولانا حسین احمد صاحب کا بھی ارشاد ہے کہ :-

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو مسلمان بلکہ عیسائی۔ پارسی سب شامل ہوں۔ حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے"

(زمزم، ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

اس جمہوریت میں اقلیت کی کیا حالت ہوگی۔ یہ خود آزادی کے قائد اعظم کی زبان سے سنیئے :-

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے" (میری کہانی از پنڈت جواہر لال صفحہ ۵۴ جلد دوم)

لہٰذا متحدہ قومیت کی تعمیر کا پانچواں رکن یہ ہوا کہ اس میں نظام حکومت ایسی جمہوریت پر قائم ہوگا جو مسلم و غیر مسلم کی جماعتوں پر مشتمل ہوگی اور جس میں اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریں گے۔

یہ ہے مختصراً متحدہ قومیت کا تصور اور اسکے عناصر ترکیبی۔ اسکے برعکس اگر مسلمان چاہیں کہ من حیث المسلم اپنا الگ جماعتی تشخص قائم رکھیں تو یہ جذبہ فرقہ پرستی کا وہ شجر ملعونہ ہے جو متحدہ قومیت کی جنت ارضی میں کسی صورت میں بار آور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال فرماتے ہیں :-

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو کہ جا بجا منتشر ہے مبہم ہے۔ اور غیر متعین ہے اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے ..... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں۔ بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے"

(میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۴)

پھر فرماتے ہیں :-

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے اگر اخبارات

اس کی اسعت در اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اسکا خاتمہ ہوجاتا"

(میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۳۲)

کس قدر تاسف سے لکھتے ہیں کہ :۔

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں"

(میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳۳۱)

خود مولانا صاحب اس خیال کی تائید ان حقیقت کُشا الفاظ میں فرماتے ہیں :۔

"ہندو مہاسبھا ویسے ہی ہندوؤں کی الگ جماعت ہے جیسے مسلم لیگ مسلمانوں کی۔ کانگریس ہندوستان میں بسنے والے ہر ہندوستانی کی جماعت ہے" (زمزم ۲ جولائی ۱۹۳۸ء)

یعنی مولانا صاحب کے نزدیک بھی پنڈت جی کی طرح مسلمانوں کی الگ جماعت کا وجود نہایت قابل نفرت چیز ہے اور قابلِ فخر جماعت وہی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی بنیاد پر استوار ہو۔

تجزیہ

تفصیلات بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ متحدہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہونے ضروری ہیں۔ چند الفاظ میں یوں سمجھیے کہ متحدہ قومیت میں :۔

(۱) مختلف قوموں کی تہذیب کو مٹا کر اسے ایک جدید تہذیب میں منتقل کر دیا جائے گا۔

(۲) مختلف جماعتوں کے جُداگانہ مذاہب کی تحلیل سے ایک مرکب مذہب تیار کیا جائے گا اور جب تک وہ تیار نہ ہوگا۔ اسوقت تک مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ سمجھا جائے گا۔

(۳) مختلف قوموں کا الگ الگ نام بھی باقی نہ رہے گا۔ بلکہ ایک مشترکہ نام بنا بر وطنیت اختیار

کیا جائے گا۔

(۴) مختلف جماعتوں کی زبان بھی جُداگانہ نہیں ہوگی بلکہ اکثریت کی زُبان متحدہ زبان قرار پائیگی

(۵) متحدہ قومیت کا نظام ایک ایسی جمہوریت سے مُرتب ہوگا جو تمام اقوام کے امتزاج سے قائم ہوگا۔ اور جس کی رُو سے اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریں گے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

متحدہ قومیت میں مسلمانوں کو اپنا الگ قومی تشخص (National Identity) قائم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

لہٰذا

متحدہ قومیت کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ملک میں بسنے والی مختلف قوموں کو بنا بر وطنیت اِس طرح آپس میں ملایا جائے کہ انکی جُداگانہ تہذیب۔ تمدن، نام، زبان۔ مذہب باقی نہ رہے۔ بلکہ انکے امتزاج سے ایک مشترکہ اور متحدہ تہذیب۔ تمدن، نام۔ زبان اور مذہب کا وجود عمل میں لایا جائے اور وہ سب ملکر ایک ایسے دستورِ عمل کے ماتحت زندگی بسر کریں جو اس متحدہ قومیت کی جمہوری حکومت چلائے

یہ نظام کس طرح قائم کیا جائیگا اسکی تفصیل بھی پنڈت جواہرلال نہرو کی زُبان سے سُن لیجیے فرماتے ہیں:-

"سوسائٹی کی موجودہ کش مکش یعنی قومی جنگ، اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اسوقت تک نظامِ تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہوسکے گی۔ لیکن اسکے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی"۔ (میری کہانی ص ۴۹-۵۰)

معانی متعین ہوگئے، اربابِ نظر کے لئے تو اسکی شاید ہی ضرورت ہو کہ اب دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا جائے کہ اس قسم کی متحدہ قومیت کشتیٔ اُمت کو اپنے ہاتھوں آندھیوں کے سامنے گنگا میں

ڈبو دینے کے مُرادف ہے۔ لیکن چونکہ مولانا صاحب اِس متحدہ قومیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اسکی تشکیل مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور (معاذ اللہ) اسکی بُنیاد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ اسلیے آئندہ صفحات میں واضح کیا جائیگا کہ فی الواقعہ عجم ہنوز رموز دیں نمی داند۔ پہلے مولانا صاحب کے دلائل پیش کیے جائینگے۔

باب سوم

متحدہ قومیت اور اسلام

مولانا صاحب نے اپنے دعوے کے اثبات میں سب سے پہلے یہ دلیل پیش کی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں مختلف انبیاء کرام کی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان قوموں میں مومن و کافر دونوں شامل تھے لہٰذا اِس سے ثابت ہوا کہ مومنین و کافرین کے امتزاج سے متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لفظ قوم کی بحث کے دوران میں ارشاد ہے کہ:۔

"جس جگہ یہ لفظ مضاف واقع ہوا ہے اور مضاف الیہ مسلمان یا پیغمبر ہے اور کلام غیر مسلم کے متعلق ہے تو یقیناً اس جگہ پر مشرکوں اور کفار کا پیغمبر یا مسلمانوں کے ساتھ قومیت متحدہ میں منسلک ہونا ہی مفہوم ہوتا ہے۔ کذبت قوم نوح المرسلین۔ کذبت قبلھم قوم نوح واصحاب الرس .... الخ" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ)

اسی قسم کی اضافتوں کی مثالوں کے بعد فرماتے ہیں:۔

"غرضیکہ اِس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں غیر مسلموں کو اور پیغمبر کو ایک قوم بتایا گیا ہے اور ان کفار کو پیغمبر کیطرف بوجہ اتحاد نسب یا اتحاد وطن وغیرہ نسبت کیا گیا ہے"۔ (ایضاً صفحہ)

چنانچہ خود نبی اکرم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"بارگاہِ الٰہی سے جناب رسول اللہ صلعم اور دوسرے پیغمبروں کو بعد تقرر دین و شریعت کہا

جاتا ہے۔

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۔ الآیہ۔

کہہ دو کہ اے میری قوم تم اپنی جگہ پر عمل کرو۔ میں اپنی جگہ پر عمل کرتا ہوں"

اسکے بعد ان آیات سے حسب ذیل نتائج مستنبط فرماتے ہیں۔

"الغرض یہ آیتیں صاف طور سے واضح کر رہی ہیں کہ:۔

(الف) قرآن کے نقطۂ نظر اور استعمال میں لفظ قوم اپنے معنی کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ ہر اس جماعت پر بولا جائیگا جن میں کوئی رابطہ ہو خواہ نسب کا یا وطن کا، یا پیشہ یا زبان کا۔

(ب) قومیت میں اشتراکِ مسلم و کافر ہو سکتا ہے اور قرآن کے استعمال میں یہ موجود ہے

(ج) پیغمبر بھی اتحادِ قومیت میں کافر و مشرک اور فاسق کے ساتھ دنیا میں تعلق رکھ سکتا ہے اور رکھتا ہے۔" (متحدہ قومیت اور اسلام ص۲۲)

ہمارا خیال ہے کہ اس دلیل کو پڑھ کر آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ حضرت علامہ کیوں بلک بلک کر روتے تھے۔ اور ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کیوں خون کے آنسو بہاتے تھے جس قوم کے سب سے بڑے دارالعلوم کے سب سے بڑے عالم کی قرآن فہمی کی یہ حالت ہو اُس قوم کے مستقبل کا خدا حافظ۔ یہی وہ احساس دردانگیز تھا جس کی بنا پر حضرت علامہ کا جگر شق ہو جاتا تھا اور ہجوم غم و فورِ الم کبھی سیلابِ اشک بنکر امنڈ آتا اور کبھی یک آہِ سحرگاہی کی صورت میں "بحضورِ حق" یوں نالہ کش ہوتا کہ:۔

بآں قومے از تو میخواہم کشادے
فقیہش بے یقینے، کم سوادے
بسے نادیدنی را دیدہ ام من!
"مرا اے کاشکے مادر نزادے"

۱؎ ارمغانِ حجاز ۲۱

اسمیں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے مختلف انبیاء کرامؑ کے نام سے ان اقوام کو منسوب کیا ہے جو ان کے پیغامات کی اولیں مخاطب تھیں۔ لیکن اس انتساب سے مقصد محض تعارف تھا (جعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا) ہم نے تمہارے قبیلے اور خاندان اسلیئے بنائے کہ تم پہچانے جاؤ، مثلاً حضرت نوحؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے اس قوم کے متعلق قرآن کریم میں جہاں کچھ ذکر آئے گا تو لامحالہ اُسے قوم نوحؑ ہی کہنا پڑیگا۔ اسکے علاوہ اس قوم کے ذکر کرنے کا اور کون سا طریقہ النسب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس قوم کا کوئی دوسرا نام ہی نہ تھا۔ لیکن اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اس قوم کے کافر و مومن ملکر ایک متحدہ قومیت کے رشتہ میں منسلک ہو جاتے تھے۔ نبی کی بعثت کے وقت ایک قوم موجود ہوتی تھی کبھی اُسے اس نبی کی قوم کہہ دیا جاتا۔ اگر وہ کسی اور نام سے منسوب ہوتی تو وہ نام لے دیا جاتا مثلاً قوم عادؑ، قوم ثمودؑ کبھی اسے اُسکے کسی سردار کی طرف منسوب کر دیا جاتا۔ جیسے قوم فرعون پھر اس قوم میں سے ایک جماعت ایمان لے آتی۔ اُن کی اس وحدتِ تخیل۔ اور وحدتِ عمل کی بنا پر انہیں دوسرے لوگوں سے متمیز کرکے مومنین کی جماعت کہا جاتا۔ جو اُس قوم میں سے انکار و تکذیب کرتے انہیں کفار کی جماعت کہا جاتا۔ قرآن کریم میں جہاں مختلف انبیاء کرامؑ کے نام سے مختلف قومیں منسوب ہیں۔ وہاں اُن قوموں میں سے دو مختلف جماعتوں کا ذکر الگ الگ موجود ہے۔ اور ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ متحدہ قومیت میں کسی الگ جماعت کا ذکر یا نام یا تشخص۔ یا جداگانہ قومی وجود اصولِ قومیت کے خلاف ہوتا ہے۔ پھر قرآن کریم نے ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان ہر دو جداگانہ جماعتوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوتے تھے اور انکا الگ الگ انجام کیا ہوا کرتا تھا۔ متحدہ قومیت میں اتنی بات تو ظاہر ہے کہ اگر ڈوبے گی تو تمام قوم ڈوبے گی۔ اگر ابھرے گی تو ساری کی ساری قوم ابھرے گی یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس متحدہ قوم کا ایک حصہ سرفرازی و سربلندی۔ عزت و وقار۔ جاہ و حشمت۔ سطوت و حکومت کی زندگی بسر کرے۔ اور کوئی دوسرا حصہ ذلت و مسکنت، تباہی و بربادی افلاس و نکبت کے ہولناک عذاب میں مبتلا ہو لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جن اقوام کو مولانا صاحب انبیائے سابقہ کی متحدہ اقوام قرار دیتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی تھی کہ انمیں سے ایک جماعت (مومنین) کامیاب و کامراں ہوتی۔ اور دوسری جماعت (کافرین) تباہی و بربادی کے جہنم میں دھکیل دی جاتی۔ سارا

قرآن کریم اسی قسم کے نظائر سے بھرا پڑا ہے اور ہم تو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی تمام تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ کفر و ایمان کے نتائج میں بیّن فرق کرکے بتا دے۔ ہم یہاں صرف ایک سورت (ہود) کی چند آیات پیش کرتے ہیں۔ رکوع دوم کے اخیر دو قسم کی جماعتوں کا ذکر ہے ایک تو وہ جنکے متعلق ارشاد ہے
اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ... (۱۱/۲۳) ایمان والوں کی جماعت اور دوسری وہ جنکے متعلق فرمایا اُولٰئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۱۱/۲۱) کفار کی جماعت پھر اُن کا باہمی موازنہ ان الفاظ میں فرمایا۔ کہ ان کی شناخت میں کوئی شک شبہ باقی نہ رہے۔

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِیْرِ وَالسَّمِیْعِ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا (۱۱/۲۴)
ان ہر دو جماعتوں (فرقوں) کی مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے اور سننے والے کی سی ہے کیا یہ کبھی دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟

قرآن کریم نے یہاں لفظ بھی فریقین استعمال کیا ہے جو آپکی دور حاضرہ کی سیاست میں (Communities) کا ترجمہ ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے Communalism یعنی فرقہ پرستی کہا جاتا ہے جو متحدہ قومیت کی بالکل ضد ہے۔

اس تمہید کے بعد تیسرے رکوع سے امم سابقہ کے واقعات کا بیان شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی قوم کے تذکرہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ۔ (۱۱/۲۵)
اور یقیناً ہم نے نوحؑ کو اسکی قوم کی طرف بھیجا۔

ایک قوم تھی جس کی طرف حضرت نوحؑ کو بھیجا۔ اسکے بعد اس قوم کے مومنین اور منکرین کا ذکر ہے منکرین کی سرکشی اور بغاوت کا بیان ہے کشتی اور طوفان کا تذکرہ ہے۔ اخیر میں اس قوم کے دو فریقوں کو بالکل الگ کرکے دکھا دیا گیا ہے۔ ایک وہ جو نذر طوفان ہوگیا۔ دوسرا وہ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ محفوظ و مصئون زندہ رہا جنکے متعلق ارشاد ہے:

قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ (۱۱/۴۸)
کہا گیا اے نوحؑ ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اترو۔ اور تمپر اور جو لوگ تمہارے ساتھ ہیں اُنپر برکات ہوں

فرمایئے! کس قسم کی متحدہ قومیت تھی جس کی دو جماعتوں میں یہ تفریق ہوئی۔ پھر چھٹے رکوع میں حضرت ہودؑ کی قوم عاد کا ذکر ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ۱۱/۵۰

اور عاد کی طرف انکا بھائی ہود (بھیجا) جسنے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی عبودیت اختیار کرو

پھر اس قوم کے کفار اور مومنین کی الگ الگ جماعتوں کا ذکر ہے اور انجام کار بتایا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں پر تباہی اور بربادی کا عذاب نازل ہوا اور مومنین کی جماعت کے متعلق ارشاد ہوا

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۱۱/۵۸

اور جب ہمارا حکم آپہونچا تو ہم نے ہودؑ کو اور ان لوگوں کو جو اسکے ساتھ ایمان لا چکے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔

چھٹے رکوع میں حضرت صالحؑ کی قوم ثمود کا ذکر شروع ہوتا ہے (۱۱/۶۱) اور اس قوم کی سرکش اور فرمانبردار جماعتوں کی تفریق کے بعد قوم مومنین کے متعلق انہی الفاظ کا اعادہ ہوتا ہے جو مذکورہ صدر آیت میں مندرج ہیں ساتویں رکوع میں قوم لوطؑ کا ذکر ہے۔ اس قوم کو بھی انہی دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے منکرین پر عذاب نازل ہوتا ہے اور مومنین کی جماعت حضرت لوطؑ کے ساتھ محفوظ رکھی جاتی ہے (۱۱/۸۱)

آٹھویں رکوع میں حضرت شعیبؑ کی قوم مدین کا ذکر ہے اور انکی محولہ صدر تفریق کے بعد قوم مومنین کے متعلق آیت مندرجہ بالا کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ (۱۱/۹۴)

پھر حضرت موسیٰ کی قوم اور فرعون کی تباہی کا ذکر ہے اور ان انبیاء کرام اور انکی اقوام کی مومن و کافر جماعتوں کے انجام کے تذکرہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپکے سامنے بھی اس قوم مخاطب کے دو گروہ ہیں ایک تو مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيَكْفُرُ بِالطَّاغُوْتِ والا (جماعتِ مومنین) اور دوسرا مَنْ يَّكْفُرُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ بِالطَّاغُوْتِ والا (جماعتِ کفار) اور اس دوسری جماعت کے متعلق فرمایا:۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ (۱۱/۱۲۱)

اور اس کفار کی جماعت سے کہہ دیجیے کہ تم اپنا کام کیے جاؤ ہم اپنی جگہ کام کیے جاتے ہیں

وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ٥ ۱۱ / ۱۲۲

تم بھی انجام کا انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں!

آپ ان حقائق قرآنی کو سامنے رکھیے اور پھر اپنی بصیرت سے فتویٰ طلب فرمایئے کہ کیا ان سے دعویٰ متحدہ قومیت کے دعوے کا ثبوت ملتا ہے یا اس بات کا کہ وہ لوگ جو نبی پر ایمان لاتے تھے اور اس کی اتباع کرتے تھے۔ وہ ایک الگ جماعت کے افراد ہوتے تھے (جنہیں اِنَّا یعنی ہم کہا گیا ہے) اور دوسرے لوگ الگ گروہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ (جنہیں کُمْ یعنی تم کہہ کر پکارا گیا ہے) اب یہ ظاہر ہے کہ "ہم" اور "تم" کی تفریق سیاستِ حاضرہ کی اصطلاح میں فرقہ پرستی کہلاتی ہے۔ اور متحدہ قومیت کی تشکیل موقوف ہوتی ہے سبب "ہم" اور "تم" کا امتیاز یوں مٹ جائے کہ:-

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

پھر یہ بھی دیکھیے کہ ان ہر دو مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات کیسے ہوتے تھے۔ کیا حضرات انبیاء کرام اور ان کے متبعین کی جماعت کفار کی جماعت کے ساتھ یوں گھل مل کر رہتی تھی۔ کہ ان کی تہذیب ایک ہو جائے۔ تمدن ایک ہو جائے۔ نظریاتِ زندگی ایک ہو جائیں۔ یا مومنین کی جماعت کفار کی جماعت سے برأت اور بیزاری علیحدگی اور قطعِ تعلق کا اعلان فرمایا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ خدا نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ کفار کی تباہی کے اوپر افسوس بھی نہ کرو۔

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (المائدہ)

تو تم کفار کی بربادی پر تاسف بھی نہ کرو!

بلکہ ان کی تباہی اور بربادی پر تو خوشی اور مسرت کے سجدہ ہائے شکر ادا کرنے کا حکم ہے کہ جسدِ انسانی سے اس مادۂ فاسدہ کا نکلنا عینِ صحت ہے۔ فرمایا:-

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام)

پھر ان ظالمین کی جڑیں کٹ گئیں۔ سو اللہ رب العالمین کے لیے سب تعریف ہے۔

ملتِ حنیفہ کے مؤسسِ اولیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور انکے ساتھیوں کی حیاتِ طیبہ کو قرآن کریم نے مومنین کے لیئے اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے غور فرمایئے کہ اس باب میں انکا مسلک کیا تھا۔ اور قرآن کریم نے کس مقام پر انکے طرزِ عمل کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

لَقَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ

یقیناً تمہارے لیئے ابراہیم اور اُسکے ساتھیوں کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جو کچھ تم اللہ کے سوا پوجتے ہو اُن سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں ہم تمہارے منکر ہیں۔ اور ہم میں تم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے عداوت اور بغض ظاہر ہے جبتک کہ تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آؤ

دیکھیئے "اِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ" ایک جماعت کا نام ہے اور "قَوْمِهِمْ" ایک دوسری جماعت ہے اور ان دونوں میں بغض اور عداوت ظاہر ہے تا وقتیکہ کفار کی جماعت ایمان نہ لے آئے۔ فرمایئے یہ بغض اور عداوت کے تعلقات متحدہ قومیت ہی کا ثبوت دیتے ہیں یا متحدہ قومیت کے لیئے حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ کی شرط بھی ضروری ہے۔ ذرا آج ہندوؤں سے کہیئے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیئے بغض و عداوت رہیگی۔ تا وقتیکہ تم ایمان نہ لے آؤ پھر دیکھیئے کہ وہ آپکو کس طرح متحدہ قومیت کا جزو تسلیم کرتے ہیں یا مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع میں أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ پر عمل نہیں صرف اس کا اعلان ہی کر دیجیئے۔ پھر دیکھیئے کہ یہ بڑے بڑے وسیع الظرف قومیت پرستی کے اوتار جناب کی نسبت کیا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔

مولانا صاحب "قوم نوح" "قوم موسیٰ" وغیرہ کی مثالوں سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کر سکتے تھے کہ کفار اور مومنین کی جماعتوں کو ایک مشترک نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہوگی کہ اُمت محمدیہ کی نسبت اس نتیجہ سے بھی کچھ فائدہ نہ اُٹھایا جا سکے گا۔ اسلیئے کہ جنکے متعلق خود اللہ تعالےٰ نے کہہ دیا ہو کہ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ اُس نے تمہارا نام مسلمان رکھا، کسی کو کیا حق پہونچتا ہے کہ اُس قوم کا نام بھی کچھ

اور رکھ سکے۔

یہ تھی متحدہ قومیت کے ثبوت میں مولانا صاحب کی پہلی دلیل۔

دوسری دلیل

متحدہ قومیت کے ثبوت میں مولانا صاحب نے دوسری دلیل اسوۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش کی ہے، فرماتے ہیں:-

جناب رسول اللہ نے اپنی رسالت کے چودہ برس گزر جانے کے بعد مدینہ منورہ میں وہاں کے اور اپنے ساتھ کے مہاجر و انصار مسلمانوں اور مدینہ کے یہودیوں کو ملا کر ایک متحدہ قوم اور متحدہ امت بنائی اور نہایت مفصل عہدنامہ اس امر کے متعلق تحریر فرمایا اور اس میں تحریر کر دیا گیا کہ مشروط اور مذکورہ امور میں دشمنوں کے مقابل مسلمان اور یہود ایک امت متحدہ ہونگے مگر ہر ایک اپنے اپنے مذہب کا پابند ہوگا (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۱۳)

اسکے بعد مولانا صاحب نے اس "معاہدہ" کا ذکر فرمایا ہے جو مسلمانوں اور یہودیوں کی "متحدہ قومیت" کے مابین ہوا تھا۔

بات یوں تھی کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی رہتے تھے مدینہ منورہ کی محافظت کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی تھی۔ اسلیئے حضور نے مسلمانوں کی جماعت اور یہودیوں کی جماعت کے درمیان ایک معاہدہ کیا جسکی رُو سے قرار پایا کہ اگر کوئی دشمن باہر سے حملہ آور ہوگا تو دونوں معاہد جماعتیں متحدہ طور پر اُس کی مدافعت کرینگی۔ اس سے مولانا صاحب استنباط فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے مسلمانوں اور یہودیوں کو ملا کر ایک قوم بنا کر متحدہ قومیت کی تشکیل فرمائی تھی۔ (رسالہ کے صفحہ ۴۹)

ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیئے

مولانا صاحب نے اس دلیل کو یہاں پہلی مرتبہ ہی نہیں پیش کیا۔ بلکہ وہ اکثر اپنی تقریروں میں بھی دُہراتے رہتے ہیں اور بزعم خویش سمجھ لیتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے ثبوت میں اس محکم دلیل اور

عروۃ الوثقٰی کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ وہ اگر کبھی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں۔ تو پھر شاید یہ
حقیقت واضح ہو جائے۔ کہ یہ واقعہ تو اُنکے دعوے کی بُنیادوں تک کو متزلزل کر دیتا ہے۔ یہ بات
ایک "ابجد خواں" بھی جانتا ہے کہ معاہدہ ہمیشہ "دو مختلف" اقوام میں ہوا کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مدینہ کے
مسلمانوں کا اور وہاں کے یہودیوں کا وطن ایک تھا۔ اب اگر متحدہ قومیت کی تعمیر کے لیے اشتراکِ وطن
ہی ایک شرط ہو تو مدینہ کے مسلمان اور یہود تو اس اعتبار سے خود بخود ایک "متحدہ قوم" ہونے چاہئیں
اس متحدہ قوم میں "معاہدہ"! خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے۔ اس معاہدہ کا تو وجود ہی اس بات
پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمان ایک مُلک بلکہ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی غیر مسلموں کے ساتھ ایک قوم
نہیں بن سکتے۔ مکّہ کے مسلمان اور مدینہ کے مسلمان بلکہ حبش اور روم اور فارس کے مسلمان ایک "قوم"
کے افراد ہونگے لیکن مدینہ کے مسلمان اور مدینہ کے یہود ایک "قوم" نہیں بن سکیں گے۔ ان میں "اتحاد" پیدا کرنے کے لیے
معاہدہ کی ضرورت پڑے گی۔ نبی اکرمؐ نے یہود اور مسلمانوں کے امتزاج سے ایک "متحدہ قومیت" کی تعمیر
نہیں کی تھی۔ بلکہ اُس معاہدہ کی رُو سے دو مختلف اقوام میں باہمی اشتراکِ عمل اور اتحادِ مقاصد کی شکل پیدا
کی تھی۔ اور یہ وہ شکل تھی جسے قرآن کریم بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ سے تعبیر کرتا ہے۔ غور فرمائیے اس
آیہ مقدسہ میں ایک چیز ہے کُمْ (تم) اور دوسری چیز ہے هُمْ (وہ یعنی غیر مسلم) اور ان دونوں کے
درمیان رابطۂ اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ ہے میثاق۔ متحدہ قومیت کو چھوڑیے اسکا تو تصور ہی یکسر
غیر قرآنی ہے۔ کفر و اسلام، مومن و کافر کا باہمدگر یوں مل جانا کہ انہیں آپس میں کسی معاہدہ کی
ضرورت نہ رہے "تلبیس حق و باطل" کی ایسی خوفناک مثال ہے کہ جس سے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اسلام
کی رُو سے تو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہی میثاق کی ضرورت ہے جس کے
بغیر وہ ایک دوسرے کے ساتھ اجتماعی حیثیت سے اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے۔ اور اشتراکِ عمل بھی
صرف ان امور میں کر سکیں گے جو اُس معاہدہ میں "مشروط و مذکور" ہوں گے۔ اب ذرا یہ فرمائیے کہ
جس طرح نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہود کے ساتھ معاہدہ کرکے اتحاد پیدا کیا تھا۔ آپ حضرات نے ہندوؤں
کی جماعت کے ساتھ کون سا ایسا معاہدہ کیا ہے۔ معاہدہ کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے، وہ تو جیسا کہ

پہلے لکھا ہے آپ کی جُداگانہ قومیت ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریروں کے اقتباسات آپ دیکھ چکے ہیں۔ وہ اِسکا علانیہ تمسخر اُڑاتے ہیں۔ اور ایک جواہر لال پر کیا موقوف ہر وہ شخص (ہندو ہو یا مسلمان) جو متحدہ قومیت کا حامی ہے وہ مسلمانوں کی جُدا قومیت کے دعوے کو مذہبی جنون سے تعبیر کرتا ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والوں کو ساحرین برطانیہ کے جادو کا مسحور بتاتا ہے۔ رجعت پسند کہتا ہے۔ اُسکا نام ٹوڈی رکھتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو ہندو مسلم اتحاد کے لیئے اس راہِ عمل کو اختیار کرتا ہے جو قرآن کریم نے تجویز فرمائی اور جسپر خود نبی اکرمؐ نے عمل کرکے دکھایا۔ وہ آج ــــ ہندوؤں کی نگاہ میں نہیں بلکہ قومیت پرست مسلمانوں کی نگاہ میں ــــ اور عام مسلمانوں کی نگاہ میں نہیں بلکہ کتاب و سنت کے علمبردار ہونے کے مُدعیوں کی نگاہ میں ــــ مسلمانوں کا دشمن اور اسلام سے غداری کرنیوالا ہے۔ اور جو اُس متحدہ قومیت کا مُدعی ہے۔ جو یورپ کی تنگ نظری کی ایجاد ہے جسے ہندو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ایسا درخشاں اور تابناک بنا کر پیش کر رہا ہے اور جسکے ماننے سے قصرِ اسلام کی بنیادیں ہِل جاتی ہیں، وہ شخص واقفِ اسرارِ دین ہے۔ سرفروش و جانباز مجاہد ہے ملتِ اسلامیہ کا بہترین نمائندہ ہے۔ مسلمانوں کا صحیح ترجمان ہے۔ لہذا امام الہند ہے۔ امیر المومنین ہے۔ یا للعجب۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد ‏ ‏ ‏ کہ جبریلِ امیں را دل خراشد

چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا ‏ ‏ ‏ پرستد مومن و کافر تراشد

اقبالؒ

کبھی یہ حضرات ہندوؤں سے الگ ہو کر بات سُنیں تو انہیں بتایا جائے کہ حضرت علامہؒ یا اُنکے ہم مسلک حضرات۔ جو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے مُدعی ہیں۔ وہ انگریز کے مقابلہ میں ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ محاذ قائم کرنے کے لیئے بالکل اسی طریق عمل کو اختیار کرنا چاہتے ہیں جو نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا یعنی مسلمانوں کی الگ جماعتی حیثیت کو تسلیم کرا کر ہندوؤں کے ساتھ من حیث الجماعت ایک معاہدہ کیا جائے۔ اور اُس معاہدہ کی رُو سے ہندو مسلم اتحاد پیدا کرکے صحیح آزادی حاصل کی جائے۔ لیکن ہندو چونکہ مسلمانوں کی جُداگانہ جماعتی حیثیت کو فنا کر دینے

کے منصوبے باندھ چکا ہے اسلئے وہ اسے تسلیم کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا۔ اور سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہکر اپنے زنار کی لپیٹ میں لے لیتا ہے کہ یہ مطالبہ ہندو مسلم متحدہ قومیت کے راستہ میں ایک سخت روڑا ہے۔ اور انگریز کا پیدا کردہ ہے۔ اب مسلمان ہے کہ بلا سوچے سمجھے ہر جگہ یہی راگ الاپنا شروع کردیتا ہے۔ اور یوں حریفانِ کردہ آستیناں کا آلہ کار بنکر اسی شاخ کو کاٹنے لگ جاتا ہے جس پر خود اس کا نشیمن ہے۔ چونکہ یہ مسلک ہندو کے مفاد کے عین مطابق ہے اس لئے وہ ایسے مسلمانوں کی بیحد تعریف کرتا ہے انھیں آزادیٔ وطن کا پرستار کہتا ہے ہر جگہ ان کا سواگت کرتا ہے ان کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول چڑھاتا ہے شریعت اور دیش بندھو کہکر ڈنڈوت کرتا ہے اور یوں ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے انہیں اپنی قومیت کی دیوار میں چنتا جاتا ہے۔ کسقدر سچ کہا ہے اس مردِ حق آگاہ نے جسے فطرت کی کرم گستری نے بصیرت قرآنی اس قدر فراواں عطا فرمائی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را | نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر | بدوشِ خود برد زنارِ خود را (اقبال)

باب چہارم

مسلم و غیر مسلم کے تعلقات

موالات قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ انسانوں کے باہمی تعلقات کو دو شعبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جسے وہ موالات کہتا ہے جس کے معنی ہیں قلبی تعلقات۔ ایک دوسرے پر کامل اعتماد۔ پورا پورا دلی بھروسہ۔ ایسے تعلقات جو شرائط و قیود کی سطح سے بلند ہوں جن میں قلب کو اتنا اطمینان حاصل ہو کہ حاضر و غیب دوسرے پر کامل بھروسہ کیا جا سکے اور یہ یقین ہو کہ میرے تمام مفاد دوسرے کے ہاتھ میں محفوظ ہیں۔ ظاہر ہے کہ متحدہ قومیت میں اسی قسم کے تعلقات کا تقاضا ہوگا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے کسی مسلم کا غیر مسلم کے ساتھ اس قسم کے تعلقات قایم کرنا جائز ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں موالات کے متعلق ارشاد ہے۔

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست (ولی) ہیں۔ نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ برائی سے روکتے ہیں نماز پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اللہ اور اسی کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں ..... $\frac{9}{71}$"

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

"تمہارے دوست تو صرف اللہ اس کا رسول اور ایماندار لوگ ہیں۔ جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان میں خشوع ہوتا ہے۔" $\frac{5}{55}$

ان آیات میں حصر کے ساتھ بیان فرمایا کہ موالات کے تعلقات صرف مسلمانوں کے ساتھ پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ پھر اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ بھی بالتصریح فرما دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ ہرگز ہرگز اس قسم کے تعلقات پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ ارشاد ہے۔

"اے ایمان والو۔ اپنوں کے سوا اور کسی کو دوست (ولی) مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ وہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنائیں رکھتے ہیں بعض (منصوبے) تو ان کے منہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس قدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم آیات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں اگر تم سمجھنے والے ہو تو۔ تم ان لوگوں سے محبت کرتے ہو مگر وہ کبھی تم سے محبت نہیں کرتے۔ حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جب یہ تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ان باتوں کو مانتے ہیں اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ جاؤ۔ اپنے غصے میں مر مٹو۔ اللہ دلوں کے حالات سے باخبر ہے۔ اگر تمہیں کوئی اچھی بات پہنچ جائے تو ان کے لئے موجب غم ہوتی ہے۔ اور اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم استقلال سے رہو۔ اور ان سے اپنی حفاظت کرتے رہو۔ تو ان لوگوں کی تدابیر تم کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچا سکیں گی۔ اللہ ان کے اعمال کو محیط ہے" $\frac{۳}{۱۱۹-۱۱۷}$

ہم صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ آیات آج بھی قرآن کریم میں موجود ہیں یا (نعوذ باللہ) منسوخ ہو چکی ہیں اگر موجود ہیں تو کیا ہندوستان کا ہندو ان غیر مسلموں میں شامل ہے یا نہیں جن کی نفسیاتی کیفیت کا ذکر ان آیات میں موجود ہے۔ اور اگر ہندو ان میں شامل ہے تو کیا اس کے ساتھ موالات کے تعلقات پیدا کئے جا سکتے ہیں؟ اس کا جواب بھی خود قرآن کریم سے سُن لیجئے۔ فرمایا۔

"جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ان کو تم کبھی نہ دیکھو گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں، جو اللہ اور رسول کے خلاف ہوں۔ گو وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی۔ یا کنبہ کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں" $\frac{۵۸}{۲۲}$

یعنی وطن کا رشتہ تو ایک طرف یہاں تو خون کا رشتہ بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق پچھلے باب میں لکھا جا چکا ہے کہ انہوں نے کس قدر واضح الفاظ میں اعلان فرمایا کہ غیر مسلم جب تک ایمان لاکر جماعت مومنین میں داخل نہ ہو جائیں ان کے ساتھ موالات کے تعلقات پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس اعلان سے متصل یہ آیات بھی ملاحظہ ہوں۔ فرمایا۔

"اے ایمان والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ تمہارے پاس جو کچھ حق کے ساتھ آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں۔ ... اگر ان کو تم پر دسترس حاصل ہو جائے تو (فوراً) تمہارے دشمن ہو جائیں گے اور تم پر زبان اور ہاتھ سے مضرت رسانی پر اتر آئیں گے۔" (۶۰/۱)

واضح رہے کہ ان اشاراتِ خداوندی میں کسی خاص زمانہ، کسی خاص ملک یا کسی خاص قوم کے غیر مسلموں کا ذکر نہیں۔ بلکہ یہ تمام کفار کو محیط ہیں۔ قرآن کریم میں اس بات کی صراحت متعدد مقامات پر موجود ہے۔ جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو ہم اس کی تصریحات پیش کرنے کو بھی تیار ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو کفار کے موالات سے جو اتنی شدت سے روکا ہے تو اس کی وجہ بھی بیان فرما دی ہے کہ

ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء۔ فلا تتخذوا منهم اولیاء (۴/۸۹)

وہ لوگ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے خود ہیں اسی قسم کے تمہیں بنا لیں۔ تاکہ تم اور وہ سب برابر ہو جاؤ۔ پس ان میں سے کسی کو دوست نہ بنانا۔

اس میں یہ ٹکڑا "فتکونون سواء" قابلِ غور ہے یعنی ان کی خواہش یہ ہے کہ وہ تم کو بھی اپنے جیسا بنا لیں اور یوں تم سب برابر ہو جاؤ۔ ایک جیسے ہو جاؤ۔ ذرا غور کیجئے کیا متحدہ قومیت کی بنیاد بھی اس اصول پر نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان برابر ہو جائیں۔ ایک قوم بن جائیں۔ اقلیتیں اپنے امتیازی نشانات چھوڑ کر متحدہ قومیت کے اجزا بن جائیں۔ حالانکہ مسلمان کا امتیازی نشان ہی اس میں ہے کہ وہ صرف خدا کے رنگ میں رنگا ہو۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہو سکتا ہے) اور یہ رنگ اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا وجود

قائم ہے جب یہ امتیازی وجود مٹ جائے گا تو یہ رنگ بھی باقی نہیں رہے گا۔ غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے۔ فرمایا۔

یا ایھا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا ۸ / ۲۹

اے ایمان والو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا۔

یہ امتیاز مٹ گیا تو مسلمان بھی باقی نہ رہا۔ اور "فتکونون سواء" سے کفار کی خواہش ہی یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ امتیاز مٹ جائے۔ اور اس کے مٹانے کے لئے آج ہندوستان میں سب سے بڑا حربہ متحدہ قومیت کا تصور ہے۔ جسے مولانا صاحب عین اسلامی شعار بتا رہے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ۔

دیر صد فتنہ را بر خود کشادی
دو گامے صدقی دور از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست
تو قرآں را سرِ طاقے نہادی
(اقبال)

تعلقات کی دوسری قسم

تعلقات کی دوسری قسم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ باہمی عہد و پیمان کرے۔ معاہدہ اور میثاق کی رو سے مشروط و مذکور معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کرے۔ یہ وہ طریق ہے جس کی قرآن کریم اجازت دیتا ہے۔ اور یہی وہ طریق ہے جس کی رو سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی اتحاد نبی اکرم نے مدینہ کے یہود کے ساتھ پیدا کیا تھا۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کفار اپنے عہد و پیمان پر بھی بہت کم پابند رہیں گے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان تو اس لئے معاہدہ کی پابندی ضروری سمجھتا ہے کہ یہ اس کے خدا کا حکم ہے۔ ایسا نہ کرنے سے وہ خدا کے ہاں مجرم قرار پائیگا۔ اس کے برعکس کفار معاہدہ کو محض ایک سیاسی چال سمجھتے ہیں۔ یونان کے ایک بہت بڑے مقنن، سولن کا یہ قول کسے یاد نہیں کہ "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھنسا لیتا ہے لیکن اپنے سے طاقتور کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔" اور آج کون ہے جو سیاست عالم کا مطالعہ کرے اور اس مقولہ کی تصدیق نہ کرے۔ اسلئے قرآن کریم نے یہ بھی فرما دیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ عہد و پیمان کرنے کے بعد آرام کی نیند نہ سو جاؤ بلکہ اپنی

جمعیت اور طاقت کو ہمیشہ برقرار رکھو کہ عہد بھی انہیں قوموں سے استوار رہتے ہیں جن میں طاقت موجود ہوتی ہے۔ مسلمان اس طاقت کو عہد شکنی میں۔ یا کمزوروں کو کچلنے میں صرف نہیں کرے گا۔ بلکہ اسے اس لئے برقرار رکھیگا کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اس کے بغیر ہر بالادست قوت اسے ہڑپ کرنے کی فکر میں رہے گی۔ اسی لئے فرمایا

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ

اور ان کے خلاف ہر ممکن قوت کے ساتھ اور پلے ہوئے گھوڑوں سے اپنے آپ کو تیار رکھو تاکہ اس سے اللہ کے اور تمہارے دشمن خوف کھائیں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی۔

قومیت پرست حضرات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ فرض کیجئے ہم ہندوؤں کے ساتھ آج معاہدہ بھی کرلیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ معاہدہ کی پابندی ضرور کریں گے لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کہ معاہدہ سے مطلب یہ نہیں کہ ایک کاغذ پر دستخط کر کے پھر بے فکر ہو جانا چاہئے۔ ہندوستان میں مسلمان کچھ کم حیثیت نہیں رکھتے۔ نو کروڑ نفوس اگر اپنے اندر اجتماعیت کا جذبہ پیدا کر کے ایک نظام اور ایک مرکز کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا تہیہ کرلیں تو ہندو تو ایک طرف انگریز کی بھی مجال نہیں کہ اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ اُس وقت دیکھئے کہ معاہدوں کی توقیر کس طرح نہیں ہوتی۔ یہی تو وہ خطرہ ہے جس کے لئے ہندو مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس کے خلاف اُس نے متحدہ قومیت کا ایسا نظر فریب جال تیار کیا ہے کہ جس میں بڑے بڑے مرغِ زیرک رشتہ برپا نظر آتے ہیں ورنہ کفار پر اعتماد۔ اُن سے دلی دوستی۔ اُن کے وعدوں کا اعتبار اُن سے یگانگت کے تعلقات مسلمانوں کی اجتماعی خودکشی کے مرادف ہے۔

سطور بالا میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کیا ہے لیکن ہمارے قومیت پرست حضرات کی یہ عادت ہو چکی ہے۔ کہ وہ کسی ایسے شخص کی کوئی بات صحیح نہیں تسلیم کرتے جو

ان سے اختلاف رائے رکھتا ہو۔ خواہ وہ قرآن ہی کیوں نہ پڑھکر سنائے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس باب میں انہی میں سے ایک جلیل القدر ہستی کے خیالات پیش کر دیئے جائیں جنھیں وہ اپنے مسلک قومیت پرستی سے پہلے اپنی پوری شانِ خطابت کے ساتھ مسلمانوں کے لئے واحد اسلامی راہِ عمل قرار دیا کرتے تھے۔ سُنئے اور غور سے سنئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جو کاروانِ قومیت پرستی کے سرخیل ہیں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

مولانا آزاد کے ارشادات (مسلکِ قومیت پرستی سے پہلے)

"کفار کے عہد و پیمان کا تمہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزتِ نفس و شرف کا انھیں لحاظ تک نہیں۔ وہ قسمیں کھاتے ہیں۔ حلف اٹھاتے ہیں کہ یہ وعدہ استوار ہے اس میں دوام و استمرار ہے۔ یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں۔ مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے ایسے لوگوں کے مطیع رہنا ذلت کی بات ہے اسلام اپنے فرزندوں کو ان کی اطاعت سے باز رہنے کی ہدایت کر رہا ہے کہ خبردار یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس ہیں۔ ان کے حلف پر نہ جانا یہ ادھر کی بات اُدھر لگاتے ہیں۔ قوم میں تفرقے پیدا کرتے ہیں۔ منع خیر کے لئے نہایت مبالغہ کے ساتھ آمادہ رہتے ہیں۔ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ تعدّی ان کا شیوہ ہے۔ تطاول ان کی عادت ہے۔ ..... کفار سے مسلمانوں کو ساز و باز نہ رکھنا چاہئے۔ اُن سے بے تعلقی لازم ہے۔ جو ساز و باز رکھتے ہیں جنہیں ان سے بے تعلق رہنے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہے وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہوگی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرت کاملہ کوئی اور انتظام کریگی"

مضامین آزاد حصہ سوم

خدا معلوم وہ قرآن اب کہاں چلا گیا جو ان حضرات کو کفار کے متعلق اس قسم کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اُس بصیرتِ ایقانی کو کن چیزوں کی چمک چکا چوند کر گئی جو ان حقایق کو بے نقاب دیکھا کرتی تھی۔ اُس جرأت

ایمانی کو کس کی نظر کھا گئی جو سینے کے پورے زور سے کفا ر سے برات و بیزاری کا اعلان کیا کرتی تھی وہ حرارتِ قلبی کون سی مصلحت کوشیوں کی برفانی سلوں کے نیچے دب گئی جو کفار کی سازشوں پر یوں مشتعل ہو جایا کرتی تھی۔ اس قدرت کا ملہ پر بے پناہ توکل کو کیا ہو گیا جو کبھی یہ تسکین دیا کرتا تھا کہ کفار کی کثرت سے گھبرا کر ان کے ساتھ تعلقات بڑھانے پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔ اسلام کی کامیابی کا خدا خود کوئی انتظام کر دے گا۔ اسے قوم کی بدبختی نہ کہیے تو اور کیا کہیے کہ یہ حضرات جو کبھی اپنے صحیح اسلامی مسلک کی بنا پر قوم کی نگاہوں میں ممتاز و مقدس قرار پا گئے تھے۔ اپنی اس پوزیشن سے یوں ناجائز فائدہ اٹھا کر اب قوم کو اپنے ہاتھوں جہنّم میں دھکیل رہے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ
جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۱۴ـ۲۸

کیا تم نے ان لوگوں کی طرف بھی دیکھا جنھوں نے کفرانِ نعمتِ الٰہی کیا اور یوں اپنی قوم کو جہنم میں دھکیل دیا۔ جس میں وہ داخل ہونگے اور جو بہت بری جگہ رہنے کی ہے

باب پنجم

متحدہ قومیت کے دعوے کے اثبات میں مولانا صاحب نے صرف یہی دو دلیلیں پیش کی ہیں جن کا جواب عرض کیا جا چکا ہے لیکن اُن کے رسالہ میں چند ایک باتیں اور بھی ایسی ہیں جو اُن کی غلط فہمیوں کی آئینہ دار ہیں اور جن کا ازالہ ضروری نظر آتا ہے۔ حضرت علامہؒ نے اس نظریہ کو پیش کیا تھا کہ اسلام قومیت کی بنا اتحادِ رنگ۔ نسب۔ وطن۔ زبان۔ پر نہیں رکھتا بلکہ وہ قومیت کی بنیاد اس بلند ترین اور عالمگیر تخیل پر رکھتا ہو جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اس کو مدیر احسان نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"اسلام کی تعلیم قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے"۔ متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۲۳

اِس کے متعلق مولٰنا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسا ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ

"تمام انسان اور ہر فرد بشر خواہ یہودی ہو خواہ عیسائی۔ ہندو ہو یا مسلمان۔ سکھ ہو یا پارسی۔ بدھ ہو یا جینی۔ کالا ہو یا گورا۔ ایشیائک ہو یا افریقش (؟) سب کے سب ایک قوم ہو جائیں۔ کیونکہ شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری سب میں پائی جاتی ہے۔ سب کے سب حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کی اولاد ہیں اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ اور لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ .... الخ وغیرہ آیات (جو کہ شرفِ انسانی پر دلالت کرتی ہیں) کے مصداق ہیں۔ ہمارے علم میں کوئی آیت یا حدیث قومیت کی بنیاد ایسے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھنے والی موجود نہیں ہے"

ایضاً صفحہ ۳۴-۳۳

مشکل دراصل یوں واقع ہوئی ہے کہ حضرت علامہؒ نے اپنے بیان میں اسلامی قومیت کے متعلق جو اشارات ذکر فرمائے تھے۔ ان کا مخاطب قرآن فہم طبقہ تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ فریق مقابل کی قرآن کریم پر اتنی بھی نگاہ نہیں ہے تو وہ شاید اپنے اپنی بلندی سے کچھ نیچے اتر کر لکھتے۔

مولانا صاحب کی دلیل کا صغریٰ کبریٰ یوں قائم ہوتا ہے۔

(۱) تمام بنی آدم جس صورت میں وہ آج موجود ہیں مشرف و مکرم ہیں۔

(۲) اور موجودہ انسانوں کی باہمی خون ریزیاں اور تفرقہ انگیزیاں بالکل واضح ہیں۔

اس لئے

(۳) تمام انسان ایک قومیت کے رشتہ میں منسلک نہیں ہوسکتے۔

مولانا صاحب کا الجھاؤ دراصل اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے تمام انسان جس صورت میں وہ آج موجود ہیں مشرف و مکرم ہیں لیکن اگر وہ اپنی نگاہ میں ذرا وسعت پیدا کرتے تو یہ مشکل نہایت آسانی سے حل ہو جاتی

انھوں نے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ سے یہ سمجھ لیا کہ تمام انسان شرف واکرام میں برابر ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا اعجاز دیکھئے کہ اس نے اِسی سورت میں تمام مسئلے کو حل کر کے رکھ دیا سورۂ والتین کی متعلقہ آیات یہ ہیں۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ	ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا
ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ	پھر اُسے نچلے سے نچلے درجے میں گرا دیا
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	مگر اُن لوگوں کو نہیں جو ایمان لائے اور انہوں
فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔	نے اعمال صالحہ کئے اور اُن کیلئے غیر منقطع اجر ہیں

قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ فطرت انسانی نہایت عمدہ ہیئت پر پیدا کی گئی ہے (اَحْسَنِ تَقْوِیْم) لیکن انسان اِس دنیا میں خارجی اثرات کے ماتحت اِس چشمۂ صافی کو جب مکدر کر لیتا ہے تو اُس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ شرف واکرام کے درجے سے نیچے گر جاتا ہے (اَسْفَلَ سَافِلِیْن) لیکن جو انسان قرآن کریم کے متعین فرمودہ ایمان واعمال صالحہ پر کاربند رہتے ہیں۔ وہ شرف انسانی کی صفت سے موصوف ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو شرف واکرام سے نیچے گر گئے تھے اُن کے لئے شرف واکرام کی سطح پر پھر سے آنیکا صرف ایک راستہ کھلا ہے کہ اُمتِ محمدیہ میں داخل ہو جائیں تاکہ فطرتِ انسانی یوں اپنی اصلی شکل میں سامنے آجائے۔ جتنے انسان یوں فطرت صحیحہ کو اختیار کرتے جائیں گے (جسے اسلام کہتے ہیں) وہ ایک قومیت کے شیرازہ میں منسلک ہوتے جائیں گے۔ اور یہ دائرہ رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے تمام عالم کو محیط ہو جائیگا۔ یہ ہے تفسیر حضرت علامہؒ کے اِن بصیرت افروز الفاظ کی۔

"الفاظ شرفِ انسانی کے متعلق کسی کو دھوکا نہیں ہونا چاہئے۔ اِسلامیات میں ان سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے جو حضرتِ انسان کے قلب وضمیر میں ودیعت کی گئی ہے یعنی یہ کہ اِس کی تقویم فطرت اللہ سے ہے اور اس شرف کا غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے۔ اس تڑپ پر جو توحید الٰہی کے لیے اُسکے رگ رگ ریشہ میں مرکوز ہے"۔

فرمائیے کہ کیا یہ سورۂ والتین کی صحیح تفسیر نہیں ہے؟ لیکن مولانا صاحب اِن الفاظ کے متعلق

ارشاد فرماتے ہیں کہ "ہم کو فلسوفی الجھاؤمیں ڈالا جاتا ہے"۔ اور اس جرأت کے ساتھ کہ ہم ان حقائق اور تخیلات کے متعلق کوئی تصدیق اور کوئی تکذیب کا کلمہ پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۴۴) استغفراللہ! مولانا صاحب نے یہ بھی نہیں سوچا کہ نشتر کی زد کہاں پہنچ رہی ہے۔ حضرت علامہ" قرآن کریم کی آیات کا ترجمہ واضح الفاظ میں بیان فرماتے ہیں اور مولانا کا ارشاد ہے کہ ہم اس کی تصدیق کے لیے تیار نہیں ہیں!

مولانا صاحب نے دوسری آیت وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ کی نقل کی ہے۔ لیکن اگر ان کی نگاہیں قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر بھی ہوتیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہوجاتی کہ اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو ہم نے سورۂ والتین کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ فطرت انسانی مکرم ہے لیکن ایک انسان صرف اس وقت مکرم ہوتا ہے جب وہ اپنی فطرت صالحہ کو لئے ہوئے ہو۔ اور اس کا معیار تقویٰ جس کے متعلق فرمایا کہ

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

اللہ کے نزدیک تم میں سے مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اور تقویٰ نام ہے اس قانون الٰہی کے تابع ہونے کا جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے قرآن کریم قومیت اسلامیہ کی بنیاد اسی پر رکھتا ہے۔ اور یہی حضرت علامہ کا ارشاد ہے۔ یعنی

"نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا"

یہ ہے حضور! مطلب اس فقرہ کا کہ اسلام نے قومیت کی بنا شرف انسانیت پر رکھی ہے۔ انسانیت کو شرف حاصل ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ نبوت محمدیہ کے تابع ہو کر شجر طیب کی طرح بڑھے اور پھولے پھلے اور جو اس کے تابع نہ ہو وہ مشرف و مکرم تو ایک طرف انسانیت کے درجہ سے بھی گر جاتا ہے۔

ان شرالدواب عنداللہ الذین کفروافھم لا یومنون

یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ انسان ہیں جو کفر کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

ام تحسب ان اکثرھم یسمعون او یعقلون۔ ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا

کیا تو خیال کرتا ہے کہ یہ لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ تو حیوانات کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ

پھر انسانیت میں صحیح اخوت بھی رشتۂ ایمان کی بنا پر ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ (انما المومنون اخوۃٌ) یہ ہیں وہ

حقایق جنہیں مولانا صاحب فلسفیانہ موشگافیاں اور شاعرانہ بلند خیالیاں قرار دیتے ہیں مگر اس کے متعلق ہم اس

کے سوائے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ

تری نگاہ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ ٭ ترا گنہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ؟ — اقبالؔ

اسلام میں لچک نہیں۔ حضرت علامہؒ نے اپنے بیان میں فرمایا تھا کہ

"مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا"

اس کے متعلق مولانا صاحب رقمطراز ہیں۔

"یہ خیال کہ اسلام بالکل غیر لچک دار مذہب ہے میری سمجھ سے باہر ہے میں جہاں تک اس کے قوانین کا تتبع کرتا ہوں وہ غیر مسلموں کے ساتھ ایک ملک میں رہ سکتا ہے۔ ان کے ساتھ صلح کر سکتا ہے۔ ان کے ساتھ معاہدے کر سکتا ہے۔ ان کے ساتھ معاملات خرید و فروخت۔ شرکت و اجارہ۔ ہبہ و عاریت قرض و امانت وغیرہ وغیرہ کر سکتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا پھرنا۔ شادی و غمی میں شریک ہونا۔ کھانا۔ پینا وغیرہ وغیرہ کر سکتا ہے۔۔۔ یہود و نصاریٰ کی لڑکیوں سے نکاح کر سکتا ہے" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۵۰ و ۵۱)

اس جواب کو پڑھئے اور پھر غور فرمائیے کہ ہم نے جو عرض کیا ہے کہ مولانا صاحب سمجھے ہی نہیں کہ حضرت علامہؒ نے کیا لکھا تھا۔ وہ حرف حرف صحیح ہے یا نہیں۔ حضرت علامہؒ نے لکھا تھا کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ اصول جن پر اسلام نوع انسانی کی تشکیل ایک نظام اجتماعی میں کرنا چاہتا ہے وہ قوانین فطرت کی طرح اٹل اور بے لچک ہیں۔ وہ اصول جیسا کہ ابھی ابھی لکھا جا چکا ہے یہ ہے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کے تمام ایسے نظام جو انسانوں نے وضع کئے ہیں۔ خلاف فطرت اور خلاف منشاء ایزدی ہیں۔ یعنی رنگ۔ نسل۔ وطن۔ زبان وغیرہ کے

اشتراک سے نظامِ اجتماعی قائم کرنا۔ اس کے خلاف وہ اِن تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر وحدت قومی کے لئے وحدتِ ایمان کو بنیاد قرار دیتا ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس میں کوئی لچک نہیں۔ فرمائیے اِس چیز کو اس سے کیا تعلق کہ مسلم و غیر مسلم کا اُٹھنا بیٹھنا کھانا پینا رشادی غمی میں شریک ہونا جائز ہے۔ حیرت ہے کہ مولانا صاحب جیسی ہستی کہ جن کے علم و فضل کا شہرہ بام ثریا تک پہنچا ہوا ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ ہیئت اجتماعیہ کے اصول اور اکٹھے چلنے پھرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ باہمی اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے سے مسلم و غیر مسلم کی ایک متحدہ قومیت نہیں بن جائے گی۔ یہ اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ عام معاشرتی آداب کی باتیں ہیں جن میں اسلام واقعی اپنے اندر لچک رکھتا ہے لیکن وہ بھی صرف اُس وقت تک کہ یہ چیزیں اسلام کے کسی اصول سے نہ ٹکرائیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلمان کا کھانا کھا سکتا ہے یہ لچک ہوئی۔ لیکن اگر وہ کھانا غیر خدا کے نام پر منسوب ہو تو خواہ ظاہری شکل میں کتنا ہی پاکیزہ اور صاف ستھرا کیوں نہ ہو اسے ایک مسلمان نہیں کھا سکے گا۔ یہ وہ اصول آگیا جہاں لچک ختم ہو گئی۔ اسی طرح مثلاً مسلمان یہود نصاریٰ کی لڑکیوں سے شادی کر سکتا ہے۔ لیکن ایک مشرکہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہاں پہنچ کر وہ لچک ختم ہو گئی۔ اسی طرح مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کر سکتا ہے لین دین کر سکتا ہے۔ مواعدے کر سکتا ہے لیکن اِن کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قوم نہیں بن سکتا۔ یہاں پہنچ کر اسلام کی لچک ختم ہو جائے گی۔ یہ ہے مطلب حضرت علامہؒ کے اِس فقرہ کا کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا۔

مذہب کا صحیح مفہوم

حضرت علامہؒ نے فرمایا تھا کہ یہ نظریہ قومیت جسے مولانا صاحب نے پیش کیا ہے۔ یورپ کا وضع کردہ ہے اور اس کے جہنمی نتائج آج دنیا کے سامنے ہیں۔

اس کے جواب میں مولانا صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

> ممکن ہے کہ یورپ نے وطنیت اور قومیت کو کسی خاص مفہوم اور کسی خاص ہیئت اجتماعیہ کے لئے استعمال کیا ہو اور اس پر وہ گامزن ہو رہے ہوں۔ اور اِن مقاصد اور

نصب العین کو اپنے اپنے مذہبی اداروں کے مخالف پا کر مذہب کو سلام کر بیٹھے ہوں
یا مذہب کو صرف پرائیویٹ زندگی شمار کرنے لگے ہوں۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہمارا اقدام
متحدہ قومیت یا وطنیت کی طرف صرف انہی کیفیات اور لوازم کے ساتھ ہو جو کہ ان کے
یہاں ملحوظ ہو رہے ہیں" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۵۹)

مذہب کے متعلق ہم گزشتہ صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ قومیت پرست حضرات کے نزدیک مذہب صرف ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی وہ اجازت دے سکتے ہیں۔ وہ مذہب جو مسلمانوں کے تمام شعبہ ہائے زندگی کو محیط ہو۔ جو ان کے معاشی۔ معاشرتی اقتصادی۔ عمرانی۔ تمدنی سیاسی۔ دینی۔ دنیاوی تمام امور پر حاوی ہو۔ اور جسد انسانیت میں بمنزلہ روح کے کام کر رہا ہو۔ قومیت پرست حضرات کے نزدیک ترقی کا دشمن۔ اور متحدہ قومیت کے راستہ میں ایک خطرناک چٹان ہے۔ اس لئے پنڈت جواہر لعل نہرو دانت پیستے ہیں کہ اس قسم کا مذہب اور ایسے مذہب کے مدعی ابھی تک زندہ کیوں ہیں! اس کے باوجود مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارا اقدام متحدہ قومیت یا وطنیت کی طرف ان کیفیات کے ساتھ نہیں اٹھ رہا جو مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدت کی حیثیت دیتی ہیں یہاں پہنچکر تو ہمیں شبہ ہونے لگ گیا ہے کہ جہاں مولانا صاحب کی نگاہ قرآنی سیاست پر نہیں ہے وہاں وہ ملکی سیاست سے بھی بہت کم واقف ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت کس سے پوشیدہ ہے کہ متحدہ قومیت بنتی ہی اس وقت ہے جب یا تو مذہب ایک ہو۔ یا مذہب کو محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت دیدی جائے۔ اس کے سوائے متحدہ قومیت کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ اصل یہ ہے کہ مولانا صاحب اور اُن کے ہم مشرب حضرات کا مذہب کے متعلق تصور ہی جداگانہ ہے۔ اور یہ وہ تصور ہے جسے ایک عرصہ سے مسلمان کے سامنے صحیح اسلام بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اور جب کبھی وہ مذہب یا اسلام کا لفظ زبان پر لاتا ہے تو اس سے اس کا مفہوم یہی تصور رہتا ہے۔ یہ تصور کیا ہے؟ اسلام کے پانچ ارکان۔ کلمہ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ اگر کوئی اذان دینے میں مزاحمت نہ کرے نماز پڑھنے کی کسی جگہ ممانعت ہو روزہ پر روک ٹوک نہ لگائی جائے جب زکوٰۃ کا روپیہ اپنی مرضی کے مطابق بکھیرا جا سکے اور حج کرنے کیلئے پاسپورٹ پر کوئی پابندی نہ ہو تو یہ حضرات اسے عین مذہبی آزادی

قرار دیتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک مذہب اسی چار دیواری کے اندر گھرا ہوا ہے۔ ان ارکان کی تکمیل سے اسلام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ کھانے پینے یا شادی بیاہ کے معاملات میں کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اسی لئے یہ حضرات اس دلیل کو نہایت بلند آہنگی سے پیش کرتے ہیں کہ دیکھو کانگریس نے کراچی کے ریزولیوشن میں مذہبی آزادی کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے۔ وہ اقلیتوں کے مذہب کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہے بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں کہ

"کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور رو قار کو ٹھیس نہ لگے" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۱۶)

حتیٰ کہ پنڈت جواہر لعل نہرو جیسے خدا کے منکر کے متعلق فرماتے ہیں کہ

"جواہر لعل ہندو ہے اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کا تحفظ چاہتا ہے"[1] (تقریر مولانا حسین احمد صاحب مطبوعہ زمزم، ۲ جولائی ۱۹۳۸ء)

ان امور سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کا وہی مفہوم ہے جو ہم نے اوپر درج کیا ہے یعنی "پانچ ارکان اسلام اور ان سے متعلقہ مسائل"۔ اس سے آگے "دنیا داری" کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ اور ان امور کے لئے جس قسم کا نظام ملک میں قائم ہو جائے۔ وہ ان کے نزدیک "از روئے شریعت" جائز اور درست ہو سکتا ہے۔ اسی لئے مولانا صاحب کا فتویٰ ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) کہ ایسی جمہوریت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی شامل ہوں "عین اسلام" کے مطابق ہے۔ یہ فتویٰ جس سے قصرِ اسلامی کی ایک ایک اینٹ گر جاتی ہے محض اس بنا پر اس جرأت و بیباکی سے دیدیا گیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کا دائرہ صرف پانچ ارکان اسلامی تک ہی محدود ہے۔ جب ان میں عدم مداخلت کی ضمانت مل جائے تو امور دنیاوی کے لئے جمہوریت سے بڑھکر اور کونسا نظام بہتر ہو سکتا ہے! لیکن انھیں کس طرح سمجھایا جائے

[1] حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لا یالونکم خبالا (۴)۔ غیر مسلم تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ودوا ما عنتم جس بات سے تمہیں ضرر پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں (۴)

کہ اس قسم کی جمہوریت جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو مسلمانوں کے لئے غلامی کی بدترین لعنت ہے۔ مسلمانوں کے باہمی امور کے فیصلوں کے لئے قرآن کریم نے ایک الگ اور جداگانہ نظام قائم کیا ہے جس کی بنیادی اینٹ یہ ہے۔ کہ فلا وربک لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم (تیرے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں اپنا حکم نہ بنائیں) اور نبی اکرم سے ارشاد تھا کہ وشاورھم فی الامر (اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو) اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ وامرھم شوریٰ بینھم (ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے) جس سے ظاہر ہے کہ اس مجلس مشاورت میں کسی غیر مسلم کا دخل نہ ہوگا۔ اور اس کا صدر خود مسلمانوں کا امیر ملت۔ مرکز دین ہوگا چہ جائیکہ وہ نظام جمہوریت ایسا ہو جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔ ایسی اکثریت کے فیصلوں کے متعلق تو قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

"کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا فیصلے کرنے والا (حکم) تسلیم کرلوں۔ حالانکہ اس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل کردی ہے...... اور یوں تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور وہ سمیع و علیم ہے۔

اور اگر تو زمین پر بسنے والوں کی اکثریت کی اطاعت کرے تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کردیں۔ وہ تو صرف ظن (و قیاس) کی اتباع کرتے ہیں اور یونہی ہانکیں دوڑاتے ہیں)" ۶/۱۱۴-۱۱۵

ان آیات مقدسہ کے معانی کی تفصیل طویل ہے لیکن ارباب نظر سے ان کا مفہوم پوشیدہ نہیں ہوگا۔ اسلام کا نظام اجتماعی یہ ہے کہ تمام معاملات کے فیصلوں کے لئے کتاب اللہ بہ حیثیت اصول قانون قیامت تک کے لئے موجود ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے امامت کبریٰ کے مرکز اولین۔ جناب نبی اکرم مبعوث ہوئے۔ ان کے بعد یہ منصب امامت حضور کے جانشینوں کی طرف منتقل ہوگیا۔ لہٰذا آج مسلمانوں کے لئے اسلامی نظام زندگی یہ ہوگا کہ ان کی اپنی جماعت ہو۔ اس جماعت کے

منتخب افراد پر مشتمل ایک مجلس مشاورت ہو اور ان میں اتقی (سب سے زیادہ متقی ان کا امیر ہو۔ اور مسلمانوں کے تمام امور اس نظام کے ماتحت سرانجام پائیں۔ ایسے نظام کے بغیر محض نماز۔ روزہ سے جس قسم کا اسلام باقی رہتا ہے۔ اس سے متعلق ہم سے نہیں۔ بلکہ ایک قومیت پرست عالم دین کی زبانی سنئے۔ مولانا آزاد حیات اجتماعیہ اسلامیہ کی بحث کے دوران میں لکھتے ہیں (لیکن قومیت پرستی کے زمانہ سے پیشتر)

"احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے کہ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں اور عہد صحابہؓ سے لیکر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید رسالت کے بعد شاید ہی کوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک نہیں پہنچی ہوگی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کروں گا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلعم۔ انا امرکم بخمس اللہ امرنی بھن۔ الجماعۃ۔ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ۔ انہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع۔ ومن دعا بدعوی جاھلیۃ۔ فھو من جھنم۔ قالو یارسول اللہ وان صام وان صلی۔ قال وان صلی و صام وزعم انہ مسلم۔

یعنی فرمایا۔ تم کو پانچ باتوں کے لئے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت۔ سمع طاعت۔ ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور)

کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا خواہ وہ روزے رکھتا ہو۔ نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا ہاں ۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو۔ روزہ رکھتا ہو۔ اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔

پہلی چیز جماعت ہے ۔ یعنی تمام اُمت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہوکر اپنے مرکز قومی سے جڑکر رہنا چاہیئے ۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیئے ۔ آگے چلکر شہرت کے ساتھ ایسی حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ...... ہوکر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک مذہبی بٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی جماعت ہے ۔"

(الخلافۃ والجزیرۃ العرب ۔ مولانا ابوالکلام آزاد)

اور اسی بنا پر مولانا آزاد نے کبھی فرمایا تھا کہ

"مسلمانوں کی قومیت صادقہ کا مدار صرف شریعت ہے " (خطبۂ صدارت لاہور)

ان اُمور سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ کانگریس جس قسم کی مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے وہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ میں سمٹ کررہ جاتا ہے یا اس سے کچھ زیادہ بھی رہتا ہے ؟ اس سے آگے بڑھنے والا مذہب تو مسلمانوں سے اپنے الگ نظام اور اپنی الگ جماعت کے قیام کا مقتضی ہوجاتا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جو انتہائی فرقہ پرستی " پر دلالت کرتی ہیں۔ لہذا " قومیت پرستی " انہیں کس طرح اپنے دستور العمل میں جگہ دے سکتی ہے ہم مولانا صاحب کو کس طرح سمجھائیں کہ اسلام تو ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض مسلمانوں کی اپنی حکومت وسلطنت قرار دیتا ہے ۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور وہ اعمال صالحہ کرتے ہیں۔ یہ وعدہ کررکھا ہے کہ وہ انہیں اس دُنیا کی حکومت عطا فرمائے گا ۔

ذرا کانگریس سے کہیئے کہ اس قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیدے جو مسلمانوں کی اپنی حکومت کے قیام کی طرف منجر ہو، پھر دیکھیئے کہ کانگریس کی طرف سے کیا جواب ملتا ہو۔ اور جو مذہب مسلمانوں کو انکی اپنی حکومت کے

قیام کی طرف نہیں لے جاتا، وہ ایک پرائیویٹ عقیدہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس قسم کے مذہب کی آج بھی آزادی حاصل ہے، اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت کانگریس کے ریزولیوشن دیتے ہیں جس پر مولانا صاحب اور ان کے ہم مسلک حضرات یوں شاداں و فرحاں پھرتے ہیں۔ سچ فرمایا تھا حضرت علامہ نے کہ

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

غیر اسلامی نظام

حضرت علامہ نے فرمایا تھا کہ "ہر وہ دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے"، اس کے متعلق مولانا صاحب فرماتے ہیں:-

> اسی طرح یہ کہنا کہ نظام اسلامی اور اس کا کار بند کسی دوسرے نظام کے ساتھ شریک ہی نہیں ہو سکتا۔ غیر قابل قبول امر ہے۔ قوانین اسلامیہ اور احکام شرعیہ نے اگرچہ بہت سے امور میں کوئی نہ کوئی تجویز قائم کر دی ہے۔ مگر بے شمار امور کو زیر اباحت و اجازت رکھا ہے جن میں ہم کو اختیار ہے کہ اپنی صوابدید کے مطابق عمل کریں۔ ان ہی امور میں بادشاہتیں اور انکے حکام اور انجمنیں وغیرہ اپنے اپنے آراء و اعمال کو کام میں لاتی رہتی ہیں۔"
>
> (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۶۳)

یہاں پھر وہی بنیادی غلط فہمی الجھاؤ کا باعث بن رہی ہے۔ حضرت! دستور العمل اور نظام سے مراد وہ اصول حیات ہیں جو اسلام نے اپنے متبعین کے لئے مرتب فرمائے ہیں۔ اور جو قوانین فطرت کی طرح اٹل ہیں۔ لا تبدیل لکلمات اللہ۔ اور آپ جن چیزوں کی اجازت و اباحت کا ذکر فرما رہے ہیں وہ ان اصول کی فروعات و جزئیات ہیں۔ مسلمانوں کی الگ اجتماعی زندگی کا قیام و وجود اصول اسلام میں سے ہے جس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ البتہ قومی اور جماعتی حیثیت سے دوسری قوموں کے ساتھ اشتراک عمل اور اس کا طریق کار فرعی چیزیں ہیں جنہیں اسلامی جماعت اپنے اپنے زمانہ کے مخصوص حالات کے ماتحت خود مرتب کر سکتی ہے۔ فرع اور اصول کا فرق ایسی بیّن چیز ہے جس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا بے سود معلوم ہوتا ہے۔

غیروں کا تشبہ

مولانا صاحب نے اپنے رسالہ میں ایک اور چیز کا بھی ذکر کیا ہے جس کے لئے وہ اپنی عادت سے مجبور نظر آتے ہیں، اسلئے کہ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں اس قسم کی چیزیں بیان فرماتے رہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"بڑے بڑے دعویدار اسلامیت و مذہبیت ایسے ہیں جن کی صورت اور لباس میں اور انگریز کی صورت اور لباس میں فرق معلوم نہیں ہوتا۔" (ایضاً صفحہ ۱۱)

ہر چند یہ چیز ہماری اصولی بحث کے دائرہ سے خارج ہے اور یوں بھی ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ

درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

لیکن چونکہ مولانا صاحب اس چیز پر خاص زور دیتے رہتے ہیں، اس لئے ہم ان سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ مغرب زدہ مسلمانوں کی اس "اتباع فرنگ" پر تو وہ آئے دن اعتراضات کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی نگاہ اُن مسلمان مہاشوں کی طرف کیوں نہیں اُٹھتی جو نہ صرف لباس میں ہی بلکہ آداب معاشرت میں بھی خالص "شری یُت" بنتے جا رہے ہیں۔ ان کو بھی تو کبھی ٹوکا ہوتا کہ یہ غیروں کا تشبہ اسلام میں جائز نہیں۔ ایک قومیت پرست اسلامی درسگاہ کے ایک مسلمان پروفیسر نے ایک مرتبہ بڑے فخر سے کہا کہ وہ جب پنجاب کے دورے کے لئے نکلے ہیں تو ہر جگہ "پنڈت جی نمسکار" کہہ کر ان کا سواگت کیا جاتا تھا! ایسے حضرات کے اسلام میں مولانا صاحب کو کبھی کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ لیکن اُن سے اختلاف رائے رکھنے والوں کی ہر چیز سے کفر ٹپکتا دکھائی دیتا ہے! اسے اگر "رنگین چشمہ" کی برکات نہ کہئے تو اور کیا کہئے:

میری نگاہِ شوق پر اس درجہ سختیاں　　اپنی نگاہِ شوخ کی کچھ بھی سزا نہیں

شَهَادَةٌ مِنْ اَهْلِهَا

گزشتہ صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے پیش نظر آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ایسی دو قومیں جن کا مذہب، تمدن، تہذیب، کلچر مختلف ہوں۔ جن کے نظریات زندگی الگ الگ ہوں نصب العین حیات جداگانہ ہوں۔ وہ قومیں قرآن کریم کی رو سے، باہمدگر مل کر، ایک متحدہ قومیت کے رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ جس کا اعتراف اب غیر مسلموں تک کو کرنا پڑا ہے۔ مولانا

حسین احمد صاحب تو کفر و اسلام کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی تشکیل کا وعظ فرما رہے ہیں۔ اور ان کے امیر یعنے صدر کانگریس مسٹر بوس کا یہ ارشاد ہے کہ :-

”کلچر۔ زبان۔ تہذیب۔ غرضے کہ ہر شے میں۔ برطانیہ اور ہندوستان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لئے سوائے خوشگوار ی تعلقات کے کوئی اور چیز ان ہر دو ممالک کو آپس میں نہیں ملا سکتی۔ اور ہندوستان کی طرف سے اس قسم کے تعلقات اسی صورت میں پیدا ہو سکیں گے جب یہ ملک کامل آزادی حاصل کرلیگا“ (اسٹیٹس مین۔ مورخہ ۷ پلا)

دیکھئے یہ ہے وہ جادو جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کانگریسی حضرات خود اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی مختلف قومیں جن میں تہذیب۔ تمدن وغیرہ کا اشتراک نہیں ہوتا، ایک متحدہ قومیت میں تحلیل نہیں ہوسکتیں۔ البتہ ان میں اچھے تعلقات پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یعنے باہمی وفاق اور معاہدہ کی رو سے۔ اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ دونوں قومیں اپنے اپنے معاملات میں بالکل آزاد ہوں۔ لیکن یہی اصول جب مسلمان پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ ہندو اور مسلمان تہذیب، تمدن، مذہب وغیرہ میں ایکدوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لئے یہ دونوں ملکر متحدہ قومیت میں تبدیل نہیں ہوسکتے۔ البتہ ان میں باہمی اتحاد پیدا کیا جاسکتا ہے اور اسکی یہی شکل ہو کہ مسلمان اور ہندو اپنے اپنے معاملات میں دو جداگانہ اور آزاد قومیں ہوں اور انکے درمیان اشتراک عمل کا ذریعہ معاہدہ اور وفاق ہو۔ تو کانگریسی ہندو حضرات اسے اصول حریت نوازی کے خلاف ٹہراتے ہیں۔ اور قومیت پرست مولوی صاحبان اسے ”سحر برطانیہ“ کا پیدا کردہ کفر قرار دیتے ہیں۔ یہ ہے قومیت پرست حضرات کا اصول سیاست اور یہ ہے ان کا التفقہ فی الدین۔ یعنے یہ ہمارے آئمہ دین مسلمانوں کے ساتھ ملکر ایک اجتماعی زندگی بسر کرنے کو خلاف مذہب بتاتے ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر انکے نزدیک عین قرآن و حدیث کے مطابق ہے انکی فقہ میں میدان عرفات میں جمع ہونے والے مسلمان سب فرقہ پرست ہیں کہ وہ اپنی الگ۔ خالصتہً اسلامی جماعت کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ہری پور میں اکٹھے ہونے والے مسلمان اسلام کے صحیح ترجمان ہیں کہ وہ متحدہ قومیت کے علمبردار ہیں۔ انکے نزدیک ہندو اور مسلمان تو بھائی بھائی بن سکتے ہیں لیکن مسلمان اور مسلمان آپس میں معاملات کا رشتہ پیدا نہیں کرسکتے۔ یا للعجب۔

برہمن گفت برخیز از در غیر ۔۔۔ زیاران وطن ناید بجز خیر

بیک مسجد دو مُلّا می نہ گنجد　　　ز افسونِ بتاں گنجد بہ یک دیر (اقبال)

وطنیت کی جہنم

حضرت علامہ نے قرآن کریم کی روشنی میں بتایا تھا کہ وہ قومیت جس کی بنیاد وطنیت پر رکھی جاتی ہے نوع انسانی کے لئے کس قدر جہنمی زندگی پیدا کرنیکی موجب ہوتی ہے اور وطنیت وہ جذبہ ہے جس کے بغیر بقول مولانا صاحب۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ فرماتے ہیں:-

"ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لئے کوئی رشتہ اتحاد بجز متحدہ قومیت نہیں جسکی اساس محض وطنیت ہی ہو سکتی ہے اسکے علاوہ اور کوئی چیز نہیں" (انصاری ۱۰ جنوری)

حیرت ہے کہ ایک طرف ہمارے علماء کرام ہیں کہ جنکے گھر میں سیاسی اور تمدنی زندگی کے تمام مسائل کے لئے درخشندہ اصول موجود ہیں۔ لیکن وہ ان اصولوں کے خلاف دوسروں کے نظریات زندگی کو نصب العین حیات بنا رہے ہیں اور دوسری طرف غیر مسلم ہیں کہ وہ چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر قرآن کریم کے انہی نظریات کو صحیح اصول زندگی قرار دے رہے ہیں۔ اسی "وطنیت" کے متعلق گجروں مسٹر کے نیٹر اجن نے بمبئی یونیورسٹی کے کانووکیشن ایڈریس کے دوران میں کہا تھا۔

"عصر حاضر کا ایک مہیب ترین خطرہ جس سے بچنے کے لئے یونیورسٹی کے ہر فرد کو کامل جدوجہد کرنی چاہیئے یہ ہے کہ قومیت کا وہ تنگ نظریہ جس نے یورپ کو آج یوں جہنم زار بنا رکھا ہے۔ نوجوانوں کے دلوں میں سرایت نہ کر جائے۔ یہ وہ نظریہ ہے جسکی رو سے غلط اور صحیح جائز اور ناجائز جھوٹ اور سچ کے امتیازات "سودیشی" اور "بدیشی" کے امتیازات کے تابع ہو جاتے ہیں کبھی اس چیز کو ایام جاہلیت کی یادگار سمجھا جاتا تھا کہ ہر وہ شے جو اجنبی اور بدیشی ہو اس سے نفرت کی جائے لیکن آج یہی چیز "قومیت" کا طرۂ امتیاز ہے جس میں ۹/۱۰ حصہ یہ اصول ہے کہ وہ لوگ جو تمہارے ملک سے باہر رہتے ہوں۔ انکی طرف سے بدگمانی اور نفرت کے جذبات دل میں موجزن رہیں۔ وہ قلب جو وطنیت کے ان جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اخلاق کے تمام معیاروں کی طرف سے بے حس ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ آج حریت نوازی نام ہی اس چیز کا رہ گیا ہے کہ انسان اس اصول

پر آنکھیں بند کر کے کاربند رہے کہ "میرا ملک غلط یا صحیح" ۔ (سب پر مقدم ہے)" (انگریزی میں ۲ بیٹا)

یہ ہے وطنیت کا وہ ملعون جذبہ جس کی مخالفت اسلام نے اس شد و مد سے کی ہے اور جس کے متعلق حضرت علامہ نے آج سے آٹھ سال پیشتر اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا ۔

"سیاسیات کی جڑ حقیقتاً انسان کی روحانی زندگی میں ہے ۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی آراء کا نام نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ایک سوسائٹی ہے ۔ یا اگر آپ پسند فرمائیں تو اسے ملکی اور مذہبی نظام کہہ سکتے ہیں ۔ میرے سیاسیات میں دلچسپی لینے کا اصلی سبب یہ ہے کہ کہیں دورِ حاضرہ کے سیاسی اُصول جو دہریت پر مبنی ہیں اسلام کے بنیادی اصولوں کو متاثر نہ کر دیں ۔ میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم (وطنیت) کا سخت مخالف ہوں (اس نیشنلزم کی تعلیم ہے کہ قوم کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ وطن پر ہے) کیونکہ مجھے اس میں دہریت اور الحاد کے جراثیم نظر آ رہے ہیں ۔ اور یہ جراثیم انسانیت کے لئے سخت مضر ہیں ۔"

لیکن چشمِ فلک کو یہ نظارہ بھی دیکھنا تھا کہ اسی نظریہ وطنیت کو ایک دن ہندوستان کے سب سے اعلیٰ دارالعلوم کے سب سے بڑے کلید بردار کے حجلۂ دماغ سے کتاب و سنت کا حسین و دلکش نقاب اوڑھ کر مسلمانوں کے لئے فریبِ نگاہ بننا تھا ۔ آج اسلام کی مظلومیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے ۔ اور مسلمانوں کے لئے صفِ ماتم بچھانے کا اس سے زیادہ اندوہناک مقام اور کونسا ہو سکتا ہے ۔ حیرت ہے کہ اس پر آسمان کیوں نہ ٹوٹ پڑا ۔ زمین کیوں نہ شق ہو گئی ۔

اے محمد گر قیامت را برآری سر ز خاک   سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

اور پھر ستم بالائے ستم کہ یہ سب کچھ سہواً نہیں ہوتا بلکہ غلطی پر متنبہ کرنے والے مردِ حق شناس کو ساحرِ برطانیہ کے طلسم و افسوں کا شکار بتایا جاتا ہے ۔ اور دینِ حجازی کے اس محرمِ اسرار کو "افرنگ زدگی" کا طعنہ دے کر "برطانیہ کی عظیم الشان خدمات انجام دینے والا" قرار دیا جا رہا ہے اور یہ سب اس جرم کی بنا پر کہ وہ اس دورِ تجدد پسندی میں اس رسمِ کہن کی یاد کیوں تازہ کر رہا ہے کہ جس کی رُو سے تکہ کا بوجہل گلے نہیں لگایا جا سکتا ۔ لیکن فارس کا سلمان "اہلِ بیت" میں سے ہو سکتا ہے ۔ لیکن اس بیچارے کی مجبوری پر بھی تو نگاہ رکھیئے کہ جسے قرآن کریم کا ہر حرف پکار پکار

صدر مسز سروجنی نائیڈو نے بھی اپنی ایک تقریر میں قومیت کے متعلق قریب قریب یہی کچھ کہا ہے ملاحظہ ہو اسٹیٹسمین ۱۲/۲ ۴۲ء

کر کہہ رہا ہو کہ یہ وہ نظریہ ہے کہ:۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے

اور جیسے حضورِ رسالتمآب کے خاکِ قدم کا ہر ذرّہ اُبھر ابھر کر دکھا رہا ہو کہ یہ وہ اصول سیاست ہے کہ

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

وہ کس طرح آپ کی ہمنوائی میں شریک ہو جائے اسی مجبوری کی بنا پر تو اس نے کہا تھا کہ:۔

غلامم جز رضائے تو نجویم　　جز آں راہے کہ فرمودی نپویم

ولیکن گر بہ ایں ناداں بگوئی　　خرے را اسپِ تازی گو۔ نگویم　　(اقبال)

آخری گذارش

مولانا صاحب نے اپنے رسالہ کی "آخری گذارش" میں فرمایا ہے

"ہم اس عرض کے بعد اپنی تحریر کو اس فلسفیانہ تقریر اور شاعرانہ تخیل کے جوابات سے طویل اور دراز کرنا مناسب نہیں سمجھتے جو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے فلاسفری دماغ سے تراش کر کے ذکر فرمائی ہے" (متحدہ قومیت اور اسلام صفحہ ۔)

اور اس رسالہ کے دیباچہ نگار صاحب نے اس کے مقصد کا ان گہربار الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔

"حضرت شیخ مدظلہ نے اس بحث کے ذیل میں جن مذہبی اور سیاسی جواہرات کے منتشر ذخائر کو مجتمع فرمادیا ہے وہ نہ صرف متلاشیانِ حق کے لئے سرمایۂ طمانیتِ قلب ہی ہیں بلکہ ان سے یقیناً ہماری حیاتِ سیاسی کے ایک شاندار باب کی تعمیر ہوگی اور موجودہ و آئندہ نسلیں اسلامی نقطۂ نظر سے قومیتِ متحدہ کے مفہوم کو سمجھنے میں کسی سفسطہ کا شکار نہ ہو سکیں گی۔

کاش علامہ اقبال مرحوم آج ہم میں موجود ہوتے تو جو شبہات اس مسئلہ خاص کے بارے میں انہیں باقی رہ گئے تھے وہ بھی دُور ہو جاتے" (ایضاً صفحہ ۔)

اس مطلع اور مقطع کے متعلق ہم کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ کیونکہ یہ اس وقت درج کئے جا رہے ہیں جب حضرتِ علامہ کے استدلالات، مولانا صاحب کے اعتراضات اور ان کے جوابات قارئین کے سامنے آچکے ہیں۔ وہ از خود فیصلہ کر لیں گے کہ قرآن کریم کی رُو سے کونسا نظریہ ملتِ اسلامیہ کی زندگی کا ضامن ہے اور کونسا اُس کی خودکشی کے مترادف

وہ کونسی حیات انگیز جرس کا رواں ہے جو بلال ؓ کے نغمۂ عشق کو اپنے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہو اور وہ کونسی سکوت افزا بے سری کی لے ہے جو ناقوسِ برہمن کے شور میں گم ہو جانے میں ہی رازِ حیات پوشیدہ دیکھتی ہے ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ حضرت علامہ اگر آج ہم میں موجود ہوتے تو وہ مولانا صاحب کی اس تحقیق انیق کی داد کن الفاظ میں دیتے۔ البتہ جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں وہ تو اتنا ہی ہے کہ یا تو مولانا صاحب "متحدہ قومیت" اور "ہندو مسلم اتحاد" کے فرق کو ہی نہیں سمجھ سکے اور یا متحدہ قومیت کے متعلق اسلام کی تعلیم انکی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہے اگر پہلی بات ہے تو ملتِ اسلامیہ کے لئے ماتم کا مقام ہے کہ یہ حضرات جو قوم کی کشتیِ سیاست کے ناخدا ہونیکے مدعی ہیں۔ سیاست حاضرہ کی اس ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔ اور اگر دوسری بات ہے تو پھر معاف فرمایئے یہ کہنے میں کیا مبالغہ ہے کہ ایسا "فقیہہ ملت"۔

چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است

خلاصہ بحث

بحثِ قومیت کو اگر ہم چند مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہا جائیگا کہ مولانا صاحب کے نزدیک ایک ملک کی جغرافیائی حدود کے اندر رہنے والے انسان عقائد و اعمال کے تمام اختلافات کے باوجود ایک قوم بن سکتے ہیں اور ہمارا دعوٰے یہ ہے کہ یہ نظریۂ قومیت غیر اسلامی ہے۔ اسلام کے نزدیک صرف وہی افراد مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں جن میں وحدتِ ایمان و عمل ہو۔ مولانا صاحب نے اپنے دعوے کے اثبات میں یہ دلیل بیان فرمائی ہے کہ قوم نوحؑ اور قوم ابراہیمؑ میں تمام مومن و کافر شامل تھے اور ہمارا دعوٰی یہ ہے کہ یہ حضرات انبیائے کرامؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ اس قوم میں ایسے افراد کو الگ کرکے جن میں وحدتِ عمل و ایمان ہوتی تھی ایک جداگانہ نئی قومیت کی تشکیل فرماتے تھے۔ یہ قومیت اسلامی قومیت کے معیار کے مطابق تعمیر ہوتی تھی۔ ہم نے اپنے دعوے کے اثبات میں کتاب و سنت کی نصوص صریحہ پیش کی ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہمیں چونکہ فریق مقابل سمجھا جائیگا۔ اس لئے اس باب میں کسی آخری فیصلہ تک پہنچنے کے لئے کسی حکم کی ضرورت محسوس ہوگی۔ آیئے ہم آپکے سامنے ایک ایسے حکم کا فیصلہ پیش کردیں جو مولانا صاحب کے

نہ صرف ہم مسلک ہیں بلکہ جن کی علمی قیادت اور دینی امامت کے خود مولانا صاحب بھی معترف ہیں۔ سنیئے کان کا فیصلہ کیا ہے، اور پھر غور فرمائیے کہ یہ حضرات آج کس کے جادو سے مسحور ہو رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد البلاغ بابت ۱۱/۱۵ ۱۲ و ۱۱/۱۵ ۲۶ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

قرآن حکیم میں اگرچہ نبوت کے عام اشتراک جنسی کی بنا پر تمام انبیاء کرام کا نام ایک ساتھ اور ایک حیثیت سے آیا ہے لیکن بعض خصوصیات نوعی کے لحاظ سے اس نے انبیاء کے جو مختلف طبقات قائم کر دیئے ہیں ان میں دو سلسلے عام طور پر ممتاز نظر آتے ہیں۔

ایک سلسلہ ان انبیاء و مؤسسین کا ہے جنہوں نے اپنی دعوت کے ذریعہ نئی قومیتوں کی بنیاد ڈالی اور جو قدیم عمارتوں کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ از سر نو ایک نئی قومی عمارت بنانے کے لئے آئے تھے۔ دوسرا سلسلہ انبیاء مجددین و محدثین (بالفتح) کا ہے جنہوں نے کسی نئی اُمت کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ کسی پیشتر کی قائم شدہ اُمت صالحہ کی مزید تکمیل و تبلیغ کی یا امتداد عہد کے نتائج مضلہ و استیلائے بدعات و محدثات سے اسے نجات دلا کر فرض تجدید و احیاء ادا کیا۔

انبیاء مؤسسین

پہلے سلسلہ کا وصف امتیازی یہ ہے کہ وہ تمام قدیم نظام۔ قدیم عقائد اور قدیم اخلاق و معاملات کو مٹا کر ایک جدید قومیت صالحہ کی بنیاد ڈالتا ہے اور اس کو آب و ہوا اور جغرافیائی حدود طبعیہ کے اثر سے الگ کر کے صرف مذہبی آب و ہوا میں ترقی اور نشوونما دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں خدائے تعالیٰ نے اس صنف کے ایک نمایاں سلسلے اور اسکی ممتاز کڑیوں کا ذکر متعدد موقعوں پر ایک ساتھ کیا ہے۔

اَلَمْ یَاْتِھِمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰھِیْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَالْمُؤْتَفِکٰتِ اَتَتْھُمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظْلِمَھُمْ وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ (۹-۷۰)

کیا ان منکرین حق تک ان لوگوں کے نتائج اعمال کی خبر نہیں پہونچی جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں؟ یعنے نوح۔ عاد۔ ثمود اور ابراہیم کی قوم مدین کے رہنے والے اور وہ بدبخت جن کی بستیاں اُلٹ دی گئیں۔ (یعنے قوم لوط) ان سب کے پاس ہمارے پیغمبر دلائل اور نشانیاں

لے کر آئے تاکہ وہ ہدایت وسعادت حاصل کریں اور اپنی بداعمالیوں کے نتائج مہلکہ سے نجات پائیں۔ خدا ان لوگوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا تھا، پر افسوس اُنھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا!

اس آیہ کریمہ میں خدائے تعالےٰ نے اول حضرت نوح کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ایک نئی امت صالحہ کی بنیاد رکھی اور انکے بعد ان جماعتوں کا ذکر کیا ہے جن میں دعوتِ نوحی کے مجددین آتے رہے، پھر حضرت ابراہیم کا نام لیا ہے جو حضرت نوح کے بعد دوسرے دور قومیت کے مصدر روحانی تھے اور پھر انکے بعد کی دعوت ہائے مجددہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دعوتِ نوحی

انبیاء موسسین علیہم السلام میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ موسسہ سامنے آتی ہے جو پہلے صنف انبیا میں بلحاظ تقدم عہد کے ایک مخصوص امتیاز رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ایک جدید قوم پیدا کی اور اس کو مذہبی امتیازات ومقومات کی آب وہوا میں پرورش کرنا چاہا۔ جن لوگوں نے مذہب کی اس حبل المتین کو مضبوط پکڑا عذاب الٰہی سے نجات پائی۔ مگر جن لوگوں نے اس سررشتۂ حیات کو چھوڑ دیا ہلاک ہوگئے اور باوجود صوری ونسلی تعلقات کے خدا نے انکو نوح علیہ السلام سے بیگانہ قرار دیا انکی دعوت کی بنیاد نسل اور جغرافیہ نہ تھا وہ ایک نئی قوم پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسلئے خود انکی نسل جسمانی کے رشتہ کا بھی کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ ان کا گھرانا اب وہی قوم تھی جو حق وسعادت کے رشتہ میں منسلک ہوکر تیار ہوئی تھی اور سب سے پہلے وہ خود ہی اپنے پیدا کردہ خاندان ملت کے ایک رکن ہوگئے تھے اگرچہ وما اٰمن معہٗ الا قلیل۔

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّہٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَہْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَہْلِکَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ (۱۱: ۴۷)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ خدایا! تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ تیرے خاندان کو عذاب طوفان سے نجات دی جائیگی تو احکم الحاکمین ہے تیرا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ میرے لڑکے کو اس عذاب سے نجات دے کیونکہ وہ میرے خاندان میں داخل ہے۔ خدا نے کہا اے نوح! تو جس کو اپنا اہل کہہ رہا ہے وہ تیرا اہل نہیں ہے۔ تیرا گھرانا تو دراصل عمل صالح

کا گھرانا ہے (جس کی دعوت دیکر تو ایک صالح قوم پیدا کرنی چاہتا ہے) جو اس گھرانے میں داخل ہوا وہ تیرا ہے اور جو اس سے نکل گیا وہ تیرا نہیں رہا۔ بلکہ ان کے گھرانے کا فرزند ہوگا جسکے عمل بد کو اس نے اختیار کیا۔ پس مجھ سے وہ سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں دیا گیا۔ اے نوح! یہ نصیحت میں اسلئے کرتا ہوں تاکہ حقائق و اسرار الٰہی تجھ پر کھلیں اور تو ان لوگوں میں سے نہ ہو جائے جو علم حقیقت سے محروم ہیں۔

تشریح مزید

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو حکم دیا تھا کہ عذاب طوفان سے بچنے کے لئے کشتی بناؤ جب کشتی بن چکی تو فرمایا

احمل فیھا من کل زوجین اثنین واھلك (۱۱-۴۲)

کشتی میں تمام ضروری حیوانات و انواع کا ایک ایک جوڑا رکھ لو نیز اپنے گھرانے کے آدمیوں کو بھی سوار کرالو۔

لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کو اس سے مستثنیٰ بھی کر دیا تھا جنکے متعلق پہلے فرمان ہو چکا تھا کہ اپنے کفر و تمرد کی وجہ سے وہ اس عذاب میں ضرور حصہ پائیں گے اور انکے لئے کوئی طلب اور کوئی سوال مقبول نہ ہوگا۔

الا من سبق علیہ القول۔ مگر ان لوگوں کو ساتھ نہ لو جنکی نسبت پہلے حکم ہو چکا ہے۔

وہ پہلا حکم یہ تھا کہ لا تخاطبنی فی الذین ظلموا۔ جن لوگوں نے حق و عدالت سے انحراف کیا اور اپنی سرکشی و عدوان سے غضب ایزدی کے مورد ٹھیرے سو انکی بابت مجھ سے کچھ نہ چاہنا۔

لیکن چونکہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح کو انکے "اہل" و اقارب کو بچا لینے کا حکم دیا تھا اور ان کا بیٹا بدرجۂ اولیٰ لفظ "اھل" کے جسمانی مفہوم میں داخل تھا اس لئے آپ کو جرأت ہوئی اور جناب خداوندی میں اسے اپنا "اھل" قرار دے کر سوال کیا اس پر جواب ملا کہ انہ لیس من اھلك گو بظاہر وہ تمہارے اہل میں سے تھا لیکن درحقیقت اسے تم سے کوئی تعلق نہیں "اہل" میں وہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ سرے سے تمہاری قوم ہی میں داخل نہ رہا بلاشبہ وہ تمہاری قوم اور تمہارے گھرانے میں سے تھا لیکن اب تو تمہاری قوم دوسری ہو گئی۔ تم نے حق اور راستی کی روح پیدا کر کے جو نئی قومیت صالحہ پیدا کی ہے اب وہی تمہاری قوم وہی تمہارا گھرانا وہی تمہارے

اہل ہیں۔ تمہارا رشتہ صرف اس نئی قوم ہی کا رشتۂ اساس ہونا چاہیئے۔ وہ رشتہ خون اور جسم کا نہیں بلکہ حق اور دعوتِ حق کی روح کا ہے۔ اسی رشتہ میں منسلک کر کے یہ نئی قوم "دعوت نوحؑ" سے پیدا کی گئی ہے تمہارے جسمانی تعلقات کے جو "اہل" اس قومیت میں داخل نہ ہوئے وہ تم سے کٹ گئے اور تمہاری جگہ "عمل غیر صالح" کی فرزندی میں داخل ہو گئے"!

آگے چلکر تحریر فرماتے ہیں:۔

"انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت دراصل ان تمام عقائد و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائق نسلی سے ترکیب پاتے ہیں۔ ان انبیاء کرام کا مشن یہ ہوتا ہے کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں۔ پس اس بنا پر انکی دعوت کا اولین اسوۂ حسنہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ خود بھی نسل و خاندان کے تمام رشتوں کو توڑ دیں اور اس طرح نسلی قربانی کا طاقت ور حربہ تیار کریں اس قربانی کا اثر تمام کاروبار دعوت میں سب سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ قوم دیکھتی ہے کہ کس طرح داعی الی الحق نے اپنے تمام رشتوں کے گھر کو اجاڑ دیا اور اس عمارت کا ایک گوشہ بن گیا جسکی چھت کے نیچے ہمیں جگہ دے رہا ہے۔

چنانچہ انبیاء کرام و رسل عظام کے اس سلسلہ میں جنہوں نے نئی قومیتوں کی بنیاد رکھی ہے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا مقام ہے اور چونکہ انکی دعوت اسی پہلی قسم کی دعوت تھی۔ اسلئے ضرور تھا کہ اسکا اولین قربانی کا بھی وہ اسوۂ حسنہ قائم کرتے۔ پس آیۂ کریمہ مندرجہ صدر میں جب انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے خدا کو پکارا تو ارشاد ہوا کہ یہاں جسمانی رشتے کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تمہارا بیٹا عمل صالح کے اس نئے گھرانے میں داخل ہو جاتا جسکی تم نے بنیاد رکھی ہے تو وہ تمہارا عزیز تھا۔ لیکن اس نے عمل صالح کی جگہ عمل غیر صالح سے رشتہ جوڑا پس اب اس کا ذکر بیکار ہے اور یہ بنائے قومیت کا وہ ناموس الٰہی ہے جس کا تمہیں علم ہونا چاہیئے۔

قال رب انی اعوذ بک ان اسئلک ما لیس لی بہ علم۔ حضرت نوحؑ نے عرض کیا۔ اے میرے پروردگار میں اپنے ضعف بشری کا اعتراف کرتا ہوں اور تیری رحمت و مغفرت میں پناہ لیتا ہوں کہ جس چیز کی حکمت و حقیقت پر میری نظر نہ تھی۔ میں نے اسکی نسبت تجھ سے سوال کیا!"

پھر ارشاد ہے:۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جس نئی اُمت کی بُنیاد رکھنی چاہی تھی اگرچہ ضلالتِ عصر اور جہلِ انسانیت اس سے دست و گریباں رہی اور اسلیئے ما آمن معہ الا قلیل (۱۱۔۴۰) اُنپر ایمان لانے کی سعادت نہیں ملی۔ مگر ایک چھوٹی جماعت کو۔

"تاہم جس اُمّتِ صالحہ کی اس عہد اُولیٰ میں بُنیاد پڑی تھی وہ ضائع نہ گئی۔ اور خدا کا کوئی حکمِ دعوت ضائع نہیں جا سکتا۔ اگرچہ خود حضرت نوح پر بہت کم لوگ ایمان لائے کیونکہ انسانی مدنیت و عمران کا بالکل عہدِ طفولیت بلکہ اس سے بھی مقدم تر دور تھا۔ اور مذہب کا سلسلہ ارتقا ابھی اپنی ابتدائی کڑیوں سے ایک دو قدم آگے بڑھا تھا لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام اور اُنکے صدیقین و متبعین کی اولاد زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلی تو وہ اپنے ساتھ اس نئی قومیت کے عقائد و اعمال بھی لیگئی۔

. . . .

یہ دراصل اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت نوح کی دعوت کسی خاص نسل اور قوم کو زندہ کر دینے کے لیے نہ تھی بلکہ وہ اس قسم کی دعوت میں داخل تھی۔ جو موجودہ نسلوں اور قوموں سے بالاتر ہو کر خود ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے۔ اور اسکی بُنیاد محض اُخوتِ دینی پر قائم ہوتی ہے پس وہ جغرافیہ و نسل سے ماوری رہ کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے اور زمین کا ہر ٹکڑا نوعِ انسانی کا ہر حصہ، اقوام و ملل کی ہر نسل اسکے دامن میں پناہ لے سکتی ہے۔" (اختتام اقتباسات البلاغ)

. . . .

یہ تو ہے وہ نظریہ قومیت جسکے ہم مدعی ہیں۔ اسکے برعکس وہ نظریہ قومیت جسکی بنا ر وطنیت پر ہے اسے ساحرین یورپ نے کس طرح مسلمانوں کے اندر پھیلایا ہے اور وہ کیسا ابلیسانہ جال ہے اسکے متعلق مولانا آزاد البلاغ بابت ۲۶ ۱۱ کے عربی افتتاحیہ میں فرماتے ہیں۔

"فالافرنجیہ! الافرنجیہ! الزموھا تکونوا من الفائزین، والقومیۃ! القومیۃ! اعلنوھا ان کنتم مومنین ۔۔۔۔۔۔ فاولئک حزب الشیطن الا ان حزب الشیطن ھم الخاسرون (۵۸۔۱۹) (فرنگی فتنوں کے خطیب، شور مچاتے ہیں کہ فرنگیت! فرنگیت! اسے قبول کر لو۔ اگر تم کامیابی چاہتے ہو اور قومیت! قومیت! کا خوب ڈھنڈورا پیٹو اگر تم مومن ہو۔ (مولانا فرماتے ہیں) خبردار یہ سب شیطانی گروہ ہیں اور شیطانی گروہ ہی ناکام و نامراد ہونیوالا ہے۔"

افکارِ عالیہ

(از حضرت علامہ علیہ الرحمۃ)

"حضرت علامہ اقبالؒ کے یہ افکارِ عالیہ لکھنؤ کے مشہور انگریزی اخبار روزنامہ ایڈ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ اور اب پہلی مرتبہ انکا اُردو ترجمہ ناظرینِ طلوعِ اسلام کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔"

عرب کی معاصرانہ شاعری

تاریخ نے اپنے دامن میں دیگر حقائق کے ساتھ ان تنقیدی حقائق کو بھی محفوظ کرلیا ہے جو پیغمبرِ اسلام علیہ السّلام کیطرف سے عرب کی معاصرانہ شاعری پر کیگئیں تھیں۔ ان میں سے دو تنقیدیں ہندوستان کے ان مسلمانوں کے لئے بہت دلچسپ ہیں جنکا لٹریچر زیادہ تر انکے قومی و ذہنی انحطاط کی پیداوار ہے اور جو اب جدید نظریات و مقاصد کے متلاشی ہیں۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی ان تنقیدوں میں بتایا گیا ہے کہ شاعری کیسی ہونی چاہیئے۔ اور کیسی نہ ہونی چاہیئے"۔

(۱) مشہور شاعر امراء القیس اسلام سے قبل گزرا ہے اسکے متعلق ہمارے پیغمبرؐ کی تنقید قابل مُلاحظہ ہے آپنے ارشاد فرمایا۔

هو اشعر الشعراء وقائدهم الى النّار

(وہ شاعروں میں بہترین شاعر تھا اور جہنم کیطرف لیجانے میں اُنکا سردار)

امراء القیس کی شاعری میں ہم کو کیا چیز نظر آتی ہے؟ شراب ارغواں۔ کمزور کرنے والے جذبات۔ واقعات عشق و محبت۔ خاموش صحراؤں کے دلچسپ نظارے اور اُنکے حسین ترین مناظر و آثار۔ اور ان بستیوں کے اُجڑے پڑاؤ و نشان جو مدتیں ہوئیں طوفان برق و باد کی نذر ہوچکی تھیں۔ یہ سب کچھ قدیم عربی شاعری کی روح رواں ہیں۔

امراء القیس، ارادہ اور حقیقت کے بجائے تخیل سے اپیل کرتا ہے۔ اور مجموعی حیثیت سے

پڑھنے والے کے دل و دماغ کو ماؤف اور افیون زدہ بنا دیتا ہے۔ رسول اکرم کی تنقید میں ایک نہایت اہم اور نازک اصول پوشیدہ ہے وہ یہ کہ جو چیز فن (آرٹ) کے اعتبار سے اچھی ہو ضروری نہیں کہ وہ زندگی کے حسن و جمال سے بھی مطابقت رکھتی ہو۔

ایک شاعر کے لیئے اچھی شاعری ممکن ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ اپنی سوسائٹی کو جہنم کیطرف لیجائے۔ درحقیقت شاعری ایک ورغلانے والی قوت ہے اور یہ قوم کی بدبختی ہے کہ وہ زندگی کی مشکلات اور امتحانات کو ہلکا اور دلکش دکھانے کے بجائے تنزل کو پوری قوت کے ساتھ خوبصورت غلافوں میں پیش کرے اور اس طرح اپنی تنزل یافتہ قوم کو اور زیادہ تباہ کر دے۔ شاعر کا فرض ہے کہ قدرت نے زندگی اور طاقت کی جو نعمت اس کو دی ہے اسمیں وہ دوسروں کو بھی حصہ دار بنائے یہ نہ ہو کہ قوم کے پاس عزم و ہمت کا جو تھوڑا بہت سرمایہ موجود ہے اسکو بھی ڈاکہ مار کر تباہ کر دے۔

زندگی کی رفعت

(۲) اسی طرح ایک مرتبہ قبیلہ عبس کے شاعر عنترہ کا حسب ذیل شعر پیغمبر اسلامؐ کے روبرو پڑھا گیا

وَلَقَدْ أَبِيتُ عَلَى الطَّوَى وَأَظَلُّهُ ۔۔۔ حَتَّى أَنَالَ بِهِ كَرِيمَ الْمَأْكَلِ

(ما شب میں محنت اور جفاکشی میں ساری ساری راتیں گزار دیتا ہوں تاکہ شریف انسان کی طرح روزی پیدا کروں)

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام جنکا مشن ہی یہ تھا کہ وہ زندگی کو بلند اور باعظمت بنائیں اور اسکی صعوبتوں اور مشکلوں کو حسین و جمیل رنگ میں پیش کریں اس شعر کو سنکر بیحد مسرور ہوئے اور صحابہؓ سے فرمایا "کسی عرب کی ستائش نے میرے دل میں اس سے ملاقات کی خواہش پیدا نہیں کی لیکن میں اس شاعر سے ملنا چاہتا ہوں"۔

غور فرمایئے! وہ ذات اقدس جسکے منور چہرہ کی ایک جھلک دیکھنے والے پر لامحدود سعادتوں کا دروازہ کھولدیتی ہے وہ خود ایک کافر شاعر سے ملنا پسند کرتا ہے آخر اس شاعر کو دربار نبوت میں یہ عزت افزائی کیوں حاصل ہوئی؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ شاعر کا یہ شعر صداقت اور زندگی سے مملو ہے اور اس نے باعزت

مزدوری کی تکالیف کو بہترین تخیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ رسول کریمؐ کی زبانِ مبارک سے اس شعر کی تعریف ہم پر آرٹ کا ایک اور اہم اصول واضح کرتی ہے وہ یہ کہ آرٹ زندگی کا تابع ہو اس سے افضل و برتر نہیں ہے۔ انسانی تگ و دو اور جد و جہد کا ماحصل زندگی کا حسن ہے یعنی طاقتور اور تازگی بخش زندگی۔ اسلیئے انسانی آرٹ کو اسی مقصد کے ماتحت ہونا چاہیئے اور ہر چیز کی قدر و قیمت کا تعین اسی معیار پر ہونا چاہیئے۔

بہترین آرٹ وہ ہے جو ہماری خوابیدہ قوت ارادی کو بیدار کردے اور زندگی کی کشمکش کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے قابل بنا دے۔ ہر وہ خواب آور چیز جو ہماری آنکھوں سے گرد و پیش کی حقیقتوں کو اوجھل کر دے جن پر قدرت حاصل کرنا ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے۔ دراصل ذلت اور موت کا پیغام ہے۔ آرٹ کے ذریعہ انسانوں کو افیون زدہ نہ بنانا چاہیئے۔

یہ نظریہ کہ آرٹ صرف آرٹ کی خاطر حاصل کیا جائے دورِ حاضر کی ایک شاطرانہ ایجاد ہے جسکا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ ہم سے زندگی اور طاقت سلب کرلی جائے۔

رسول اکرمؐ نے عنترہ کے شعر کی جو تعریف فرمائی وہ ہمیں آرٹ کی صحیح صحیح قدر و قیمت معلوم کرنے کے اصول سے آگاہ کرتی ہے۔

(ترجمہ۔ جناب ضیاء الدین احمد برنی)

رُباعی

پھر عدل پہ مفتون ہی دنیا ہو جائے — پھر موتیوں سے پُر ترا دریا ہو جائے
ہٹلر بھی ہیں بہتیرے مسولینی بھی — اللہ عمرؓ بھی کوئی پیدا ہو جائے

(اخگر مرادآبادی)

لامرکزیت

انفرادیت ہے اقوام و اُمم کے حق میں موت
اُن کے سائے سے بھی ہے اقبال کتراتا ہوا

آہ وہ ملت کہ جو رکھتی نہیں زیرِ امام
دم بدم دیکھیگا تو اس پر زوال آتا ہوا !

وہ سمجھتی ہے جسے جنت کی راہِ مستقیم
راستہ جاتا ہے وہ دوزخ کو بل کھاتا ہوا

دین و دنیا کچھ نہیں ملتا ہے مرکز کے بغیر
بڑ میری ملت پہ ادبار منڈلاتا ہوا

اجتماعیت کے اوپر ہے بنا اسلام کی
دیکھتا ہوں میں اِدھر مسلم کو پھر آتا ہوا

اس رواقِ نیلگوں میں مجکو آتا ہے نظر
اپنی ملت کا ستارہ نور برساتا ہوا

اسلم حمید اجپوری

(مسلسل از طلوع اسلام ماہ نومبر ۱۹۵۵ء)

پیامِ اقبالؒ اور قرآن کریم

(جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے)

لَا اِلٰہ ـــــــــ اِلَّا اللہ

اگر کوئی شخص قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کرنا چاہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ قرآن کریم جو پیغام نوعِ انسانی کو دیتا ہے وہ ہے لَا اِلٰہ۔ اِلَّا اللہ اِس کلمہ کے دو حصے ہیں ایک سلبی (Negative) یعنی اِس امر کا یقین۔ اِس حقیقت کا اعتراف کہ دُنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جسکے سامنے جھکا جائے، جس کی غلامی اختیار کی جائے۔ جسے آقا تسلیم کیا جائے۔ جسے اپنی حاجات کا قبلۂ مقصود سمجھا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ تخریبی پہلو ہے۔ یعنی جو کچھ پہلے ذہن میں موجود ہے، اُسے مٹا دینا ہوگا۔ بھلا دینا ہوگا۔ جب زمین یوں صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر ہوگی، پھر ایجابی پہلو Affirmative side آئے گا تمام قوتوں کے انکار کے بعد اِس امر کا اقرار آئیگا کہ ہاں! مگر ایک قوت ایسی ہے جس کی غلامی اختیار کرنا ضروری ہے جسکے سامنے جھکنا زیبا ہے اور جسے اللہ کہتے ہیں۔ تمام قوتوں کو راستہ سے ہٹا کر یوں خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق پیدا کر دینا۔ یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ دُنیا میں اِس تعلیم کو سب سے پہلے ایک منضبط شکل میں پیش کرنے والے حضرت خلیل اللہ تھے اُنکی حیاتِ مقدسہ کا یہ اہم واقعہ سب کو معلوم ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کے صنمکدے کے تمام بُتوں کو پہلے توڑا اور اسکے بعد خدائے واحد کیطرف دعوت دی۔ پہلا قدم لَا اِلٰہ تھا اور اسکے بعد اِلَّا اللہ۔ جب تک مکان خالی نہ ہو نیا مکین آکر نہیں بستا۔ اِس حقیقت کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

صنمکدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل!

یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لَا اِلٰہ میں ہے

اس لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی تفسیر سورۃ بقر میں یوں آئی ہے۔

فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی

لَا انْفِصَامَ لَھَا۔ (۲/۲۵۶)

جو شخص ہر سرکش قوت کا انکار کرکے فقط ایک اللہ پر ایمان رکھتا ہے اُسنے ایک ایسے

مضبوط سررشتہ کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا!

اسی کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے ایک شخص مسلم بنتا ہے۔

بیا کہ مثل خلیل ایں طلسم در شکنیم کہ جز تو ہر چہ دریں دیر دیدہ ام صنم است

شرک کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کسی پتھر کی مورتی کے سامنے جھک جانے ہی کا نام ہے اور بس لیکن قرآن کریم کی رُو سے شرک یہی نہیں بلکہ اللہ کے سوا اور کوئی طاقت ہو اسکے سامنے جھک جانے کا نام شرک ہے۔ اور یہ قوتیں وہ بُت ہیں جن کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں۔ بلکہ یہ خود ذہن انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں اُنکا مسکن کوئی مندر نہیں۔ بلکہ خود قلبِ انسانی ہوتا ہے۔ مال و اولاد کا بُت۔ عزت و جاہ کا بُت، دولت و ثروت کا بُت۔ حکومت و سلطنت کا بُت۔ ملک و نسب کا بُت اور نہ معلوم کون کون سے لات و منات اور کون کون سے ہُبل و عزیٰ ہیں جو ہر آن اسکے نہاں خانۂ دماغ میں تراشتے رہتے ہیں جنکے سامنے کھڑا یہ کانپتا ہے، لرزتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ سجدے کرتا ہے۔ ماتھے رگڑتا ہے یہ ہیں وہ بُت جنکے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را

ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

یہ بُت انسان کی خواہشات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اور یہ ہے شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں جاگرتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی شرک کے متعلق فرمایا ہے۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ وَاَضَلَّہُ اللہُ عَلٰی عِلْمٍ۔ (۴۵/۲۳)

(کیا تو نے اسکو بھی دیکھا جسنے اپنی خواہشات کو ہی اپنا معبود بنا لیا ہے وہ جسے اللہ نے باوجود علم و عقل ۔ کے سمیت راستے سے ہٹا دیا)

کہ علم کا تقاضا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا۔ لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجائیں۔ جب خواہشات دماغ پر قابو پالیں تو پھر علم و عقل کبھی صحیح راستہ کیطرف رہنمائی نہیں کر سکتے۔ یہی وہ بت ہیں جنکی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے فرماتے ہیں :۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ایک زنجیر سے اسکا پاؤں نکالا جاتا ہے تو یہ دوسری میں الجھا لیتا ہے ایک کی غلامی کا طوق اسکے گلے سے اتارا جاتا ہے تو دوسرے کی غلامی کا طوق پہن لیتا ہے۔ حالانکہ جس رسولِ اکرمؐ کی امت ہونے کا یہ مدعی ہے اُن کی بعثت کا مقصد ہی ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۷/۱۵۷

(وہ انسانوں کے طوق و سلاسل اتارنے کے لیے بھیجا گیا ہے اُنکے بوجھ ہلکے کرنے کو، اور اُنکے پاؤں سے زنجیریں اُتروانے کے لیے)

لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ :۔

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آزری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب نام او رنگ است وہم ملک و نسب
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن تیغِ لا موجود الا ھو بزن +

لہ تنہا عقل کیا کام کرتی ہے اسکے متعلق پروفیسر جوڈ اپنی کتاب Guide to Modern Thoughts میں لکھتا ہے :۔

"عقل تو انسانی جذبات کی لونڈی ہے اس کا کام یہ ہے کہ ہماری خواہشات کے حصول کے لیے ذرائع بہم پہنچائے اور جو کچھ جذبات کے ماتحت کرنا چاہیں اسکے جواز میں دلائل فراہم کرے"

پھر جب تک دماغ سے ان غیر خدائی قوتوں کو نکالا نہ جائے، خدا کی حقیقت ذہن میں نہیں آسکتی جب تک لوحِ قلب صاف نہ ہو توحید کے نئے حروف و نقوش اس پر لکھے نہیں جاسکتے۔ فرماتے ہیں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے   ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیے

یہی نفی اور مثبت کے دو ٹکڑے ہیں جن کے جوڑنے سے کلمۂ توحید بن سکتا ہے۔ جب تک آپ دوسرے آقاؤں کو جواب نہیں دیتے کبھی نئے آقا کی غلامی اختیار نہیں کرسکتے۔ جب تک اس پرانی دنیا کو ویران نہیں کیا جاتا جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس زنگ کو اتارا نہیں جاتا تلوار پر آب نہیں چڑھ سکتی۔ رموز میں ارشاد ہے۔

آتشے افروز از خاشاکِ خویش   شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

اس کو بانگِ درا میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو   خوفِ باطل کیا کہ ہے غارتگرِ باطل بھی تو

حق آنے سے باطل خود بخود فنا ہو جاتا ہے اندھیرے کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب چراغ آجائے تو گھر چھوڑ جائے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ ١٧ / ٨١

دیکھئے کہ حق آیا اور باطل غائب ہو گیا باطل تو بنا ہی اس لئے ہے کہ فنا ہو جائے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس فروغِ حق کے لیے کرنا کیا چاہیے۔ فرمایا:۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ   پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار   اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار   تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

حضرت علامہؒ کے کلام میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انکے الفاظ کے انتخاب میں جہاں "حسنِ شعریت" ملحوظ ہوتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہتی ہے کہ ان الفاظ کا استعمال محض برائے "بیت گفتن" نہ ہو۔ بلکہ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ بھی قرآن کریم کے مختلف حقائق کے

آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اگر میں اس لحاظ سے ان کے اشعار اور اشعار کے الفاظ کی تشریح کرنے لگوں تو ظاہر ہے کہ ؏ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لیئے

ہر چند جی چاہتا ہے کہ ایسا بھی ہوتا کہ ان کے کلام کی عظمت پورے طور پر سامنے آجائے لیکن عدم گنجائش مانع ہے مثال کے طور پر مذکورہ صدر اشعار کے پہلے شعر میں "صداقت کے لیئے مرنے کی تڑپ" کا ذکر ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ پُرشوکت الفاظ شعر میں حرارت پیدا کرنے کے لیئے ہے لیکن حقیقت اس سے کہیں بلند ہے نبی اکرمؐ کے سامنے یہود وغیرہ بہت سی حجتیں پیش کرتے بحث و جدل کا تقاضا کرتے لیکن قرآن کریم نے سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لیئے ایک اور ہی معیار پیش کر دیا اور چیلنج دیدیا کہ آؤ اس کسوٹی پر پورے اترو۔ فرمایا:۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۲/۹۴

اگر تم سچے ہو تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔ مرنے کی تڑپ پیدا کرو۔ یہ ہے صداقت کی پہچان

دیکھیئے حضرت علامہ اس حقیقت کو ایک مصرع میں کس خوبصورتی سے بیان کر گئے ہیں۔ دوسرے مصرع میں "پیکرِ خاکی" میں جان پیدا کرنے کے الفاظ آتے ہیں لیکن ان کی تشریح کے لیئے مجھے قرآن کریم کی روشنی میں پورے نظریۂ ارتقاء Theory of Evolution کو بیان کرنا ہوگا اسلیئے اس مقام پر اس کی تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں۔

ہاں تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ "لا" کی تخریب کے بعد "الا" کی تعمیر کی جائے جب آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ ایک قدم آگے بڑھے ہیں دورِ حاضرہ جو یکسر اضطراب اور عدم اطمینان کا دور ہے اپنی ہر روش میں "لا" ہی "لا" کا اصول اختیار کیئے جا رہا ہے اور اس تخریب کو جہادِ زندگی سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ یہ محض استہلاک Destruction ہے تعمیر Construction نہیں۔ مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، سوسائٹی کی مسلمہ روایات، سب اسی سیلابِ "لا" کی نذر ہو چکے ہیں اور اسکے بعد "الا" کی تعمیر کہیں شروع نہیں ہوتی۔ حالانکہ تخریب کی غرض ہی ایک نئی تعمیر ہوتی ہے فرماتے ہیں:۔

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا — سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ
نہادِ زندگی میں ابتدا "لا" انتہا "الا" — پیامِ موت ہے جب "لا" ہوا "الا" سے بیگانہ

وقتِ نماز

قرونِ اولیٰ

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز — قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

(علامہ اقبالؒ)

عصرِ حاضر

آگیا جلسۂ قومی میں اگر وقتِ نماز! — حضرتِ صدر کچھ اس طرح ہوئے نطق طراز!

ختم کرتا ہوں میں تقریر کا مضمونِ دراز — کہ جھکائیں درِ خالق پہ جبینِ نیاز

کہہ کے یہ بیٹھے جو صدر تو موٹر کی طرف

لوگ بھی چلدیے مسجد کے عوض گھر کی طرف

(اسد ملتانی)

بصائر

خودداری، استقامت اور رائے کی پختگی وہ اوصاف ہیں جن پر ایک انسان بجا طور پر ناز کر سکتا ہے یہی وہ جوہر ہیں جو انسان کی فکری و عملی صلاحیتوں کا پتہ دیتے ہیں۔ اور ان ہی کی بدولت انسان کو اخلاقی اور ذہنی برتری حاصل ہوتی ہے لیکن اصل میں بڑی خوبی کسی چیز کا صحیح استعمال ہے۔ غلط استعمال نہ صرف یہ کہ حقیقت کو منقلب کر دیتا ہے بلکہ ایسا انسان دائرۂ کمال سے بھی خارج ہو جاتا ہے۔

آجکل خودداری و استقامت اور وسیع القلبی کی ایک نئی قسم ایجاد کی گئی ہے جس کو اختیار کرنے کا فخر ان حضرات کو حاصل ہوا ہے جو جمہور کو مطمئن کرنے کے بجائے اضطراب و پریشانی کی دلدل میں پھنسانا ہی اپنا سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ جماعت کے فیصلے کچھ ہیں اور انکی انفرادی رائیں کچھ اور، جمہور کے مطالبات کی نوعیت کچھ اور ہے اور انکی "دور رس" نگاہیں کسی اور ہی چیز کے مشاہدہ میں لگی ہوئی ہیں جماعت انہیں پکارتی ہے مگر وہ ان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے جمہور ان کو جھوڑتے ہیں مگر وہ لبوں پر مہر خاموش لگائے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ وہ "خود دار" ہیں۔ صاحبِ "عزیمت" ہیں انکے فیصلے اٹل ہیں اور خدا نے انکے سینہ کو اسقدر "وسیع" کر دیا ہے کہ جمہور چلا چلا کر ختم ہو جائیں اور انکو خبر بھی نہ ہو! وہ سمجھتے ہیں کہ جمہور انکا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ یہ تو عوام کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کے پیچھے پڑ جائیں تو دم ہی نہ لیں۔ اور برابر اسکا تعاقب کرتے رہیں۔ انکے نزدیک عوام کا جوش وقتی ہوتا ہے متفقہ صدائیں گرد و باد کی نذر ہو جاتی ہیں اور انکی چیخ و پکار کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

یہ ہے متمردانسانوں کی "وسیع القلبی۔ فراخ حوصلگی۔ سیر چشمی۔ کشادہ نظری" اور "استقامت و عزیمت" کہ جمہور کو پاگل تصور کر لیا جائے اور اپنے دماغ کو اثر قبول کرنے سے روکا جائے۔

لیکن ایک مومن قانت، ایک سچا رہنما ایک حقیقی فدائی اس وسیع القلبی کو انانیت تمرد و تکبر

عذر و بیوفائی۔ اہمال و تغافل پر محمول کریگا۔ وہ اپنے آپکو جمہور کا نمائندہ اور جماعت کا ترجمان تصور کرے گا۔ جماعت کی ہر آواز اسکو بیچین کر دیگی اور جمہور کا مطالبہ اسکی نیند تک حرام کر دے گا وہ سوچے گا کہ جماعت کیوں الگ ہو رہی ہے اسکا کون سا گناہ ہے کہ جماعت اس سے ترکِ تعاون اور قطع علائق کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ وہ کون سی مصیبت ہے کہ جمہور نے اُسے الگ کاٹ کر پھینکدیا ہے غرض ایسا شخص جو صاحبِ عزیمت و استقامت بھی ہوگا اور قوم کا ترجمان و رہنما بھی وہ جمہور کی بغاوت کو اپنے لیے "من شذ شذ" کی وعید کا ایک تازیانہ سمجھے گا اور جماعت کی مخالفت کے بعد وہ یقین کریگا کہ زمین باوجود فراخ ہونے کے اُسپر تنگ ہو گئی ہے' وضاقت الارض بما رحبت!

آیئے ہم پیغمبر اسلامؐ کی مقدس زندگی میں اور ان مقدس مسلمانوں میں جنکی تقدیس پر خود تقدیس کو ناز ہے۔ اس "وسعتِ قلبی" اور "سیر چشمی" کی مثال تلاش کریں اور دیکھیں کہ عہدِ اول کا مومن قانت جمہور اور جماعت کو کیا سمجھتا تھا۔ اور متفقہ مخالفت سے اُسکے دماغ پر کس قسم کے نقوش مرتسم ہوتے تھے۔

کعبؓ بن مالک رسول اللہؐ کے صحابی اور تربیت یافتہ ہیں۔ خدا کی راہ میں عظمتِ اسلام کی بقاء کے لیے متعدد جہاد کر چکے ہیں اور بارہا مالی ایثار کے نمونے بھی پیش کر چکے ہیں لیکن اتفاق سے وہ جنگ تبوک میں شرکت نہ کر سکے۔ نیت بخیر تھی' اسلام پر بھی ایمان تھا۔ صرف وقتی کمزوری تھی جسنے انکو شرکتِ جنگ سے باز رکھا۔

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ تمام مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پا برکاب تھے حضرت کعب بن مالک ہلال بن اُمیہ۔ مرارہ بن الربیع نے تیاری سے انکار نہیں صرف تساہل کیا اور دل میں کہا کہ کل چلے جائینگے۔ یہانتک کہ رسول اللہ صلعم اور جاں نثار صحابہ تیار ہو گئے۔ حضرت کعب رضؓ یہی خیال کرتے رہے کہ ایک دو روز میں جماعت سے جا ملونگا۔

جب حضرت کعب نے دیکھا کہ مدینہ میں یا تو منافقین رہ گئے ہیں یا اصحاب عذر تو انکو اپنے تخلف پر سخت افسوس ہوا۔ عین جنگ تبوک میں جماعت کے سامنے رسول اکرم صلعم نے آپکو یاد فرمایا

قبیلہ بنی سلمہ کے ایک شخص نے کہا۔ یا رسول اللہ! وہ عیش و عشرت کی وجہ سے نہیں آیا! مگر حضرت کعبؓ کی صداقت اور فداکاری کا یہ عالم تھا کہ فوراً حضرت معاذ بن جبل انکی طرف سے صفائی پیش کرنے لگے اور فرمایا غلط کہتے ہو وہ شخص بڑا نیک ہے۔

جب نبی الرحمۃ جنگ سے واپس ہوئے۔ اور مدینہ کے قریب آگئے تو کعبؓ کو فکر ہوئی کہ اپنی غیر حاضری کے لیے کیا حیلہ تراشوں۔ مگر منزل پیغمبرؐ کے تربیت یافتہ شخص کے دل نے گوارا نہ کیا کہ خدا کے رسول سے دھوکا کیا جائے آپ نے عزم کرلیا کہ دریافت کرنے پر سچی سچی بات کہدونگا۔

جب حضورؐ تشریف لائے اور نماز صبح کے بعد حسب عادت مسجد میں بیٹھے تو خدمت مبارک میں وہ لوگ حاضر ہوئے جو جنگ تبوک میں شرکت نہ کرسکے تھے۔ اُن کی تعداد اسّی کے قریب تھی' ان میں سے جو آتا عذر کرتا اور رحمۃ اللعالمین تھے کہ نہ صرف معذرتیں قبول فرما رہے تھے' بلکہ خدا کی بارگاہ میں اُنکے لیے مغفرت بھی طلب کر رہے تھے۔

غرض حضرت کعبؓ بن مالک بھی دربار نبوت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ حضورؐ نے غضب آلود تبسم کے ساتھ فرمایا آئیے! چنانچہ وہ آپکے سامنے بیٹھ گئے۔ فرمایا کعب! تم کیوں شرکت سے باز رہے؟ بولے یا رسول اللہ! میں سچ بولوں گا واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی عذر نہ تھا۔

حضورؐ نے یہ جواب سنکر فرمایا اٹھو اور جاؤ یہانتک کہ خدا کا فیصلہ آجائے۔ یہی بات ہلال بن اُمیہؓ اور مرارۃ بن الربیع سے بھی فرمائی۔

اسکے بعد اعلان کردیا گیا کہ کوئی مسلمان ان تینوں سے تعلق نہ رکھے' یہانتک کہ سلام و کلام سے بھی جماعت کو روک دیا گیا۔

اب امتحان شروع ہوتا ہے' وسعت قلبی' خودداری' استقامت اور عالی حوصلگی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ حضرت ہلال اور مرارۃ بن الربیع تو ندامت کے مارے گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے مگر حضرت کعب روزانہ مسجد نبویؐ میں حاضر ہوکر حضورؐ کو سلام کہتے۔ مگر بارگاہ نبویؐ سے اسکا جواب تک نہ ملتا! بلکہ آپ لوگوں کی نقل و حرکت کی نگرانی فرماتے اور یہ دیکھتے کہ کون لوگ کعب سے ملتے اور سلام و کلام

کرتے ہیں۔

خود حضرت کعب رضؓ کا بیان ہے کہ جماعت کی ناراضگی، اور جمہور کے ترکِ موالات نے ہماری زندگی تلخ کردی۔ بازار میں جاتے ہیں تو کوئی بات تک نہیں کرتا۔ مسجد میں جاتے ہیں تو کوئی سلام تک نہ لیتا۔ شرم و ندامت کے وجہ سے گردن نیچی رہتی۔ رنج و غم میں دل گھلا جاتا۔ رشتہ دار دوست و احباب سب ہی نے اپنی نظروں سے گرا دیا۔ یہاں تک کہ میں ایک روز اپنے چچازاد بھائی ابوقتادہ رضؓ کے باغ میں گیا خیال تھا کہ وہ اکیلا ہوگا کچھ باتیں ہونگی۔ کچھ رنج و غم کا اظہار ہوگا۔ جب میں باغ میں پہونچا تو بڑے استہانت آمیز لہجہ میں بھائی سے گفتگو کرنی چاہی مگر اُسنے جواب تک نہ دیا اور ہم سمجھے کہ زمین باوجود فراخ ہونے کے تنگ ہوگئی ہے اور زندگی کی راہیں بند ہوگئی ہیں۔ چنانچہ خود باری تعالیٰ ان مخلفین کی مصیبتوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰىٓ اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ (سورہ توبہ)

(اور ہم نے ان تینوں لوگوں کو بھی معاف کیا جو پیچھے رہ گئے تھے یہانتک کہ انپر زمین باوجود کشادہ ہونے کے تنگ ہوگئی اور وہ اپنی جانوں سے تنگ آگئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کے سوا ہمارے لیئے کوئی پناہ گاہ نہیں)

حضرت کعب رضؓ فرماتے ہیں اسی حالت میں پچاس راتیں گزر گئیں، پچاسویں رات کو میں اپنے گھر کی چھت پر لیٹا ہوا تھا کہ کسی نے سلع پہاڑ سے پکار کر آواز دی کہ اے کعب بشارت ہو اسکے بعد میں مسجد میں گیا لوگ مجھے مبارکباد دینے لگے۔ خود رحمۃ اللعالمین نے مسکرا کر فرمایا لو تمہیں خوشخبری ہو، خدا نے تم کو معاف کیا اور تمہاری تنگی دور ہوئی۔ اسپر میری خوشی کا کیا پوچھنا حضورؐ سے عرض کیا کہ اس خوشی میں میں اپنا سارا مال خدا کی راہ میں لٹانا چاہتا ہوں۔ فرمایا سارا مال صدقہ مت کرو کچھ اپنے لیئے بھی رکھ لو غور فرمایئے۔ بار بار غور فرمایئے۔ کہ حضرت کعب رضؓ بن مالک اور اُنکے دو ساتھیوں کی کیا حالت ہوگئی جمہور نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ آجکل کے "احرار" میں سے ہوتے تو یقیناً اپنی "وسعت قلبی" اور

کشادہ ظرفی" کا ثبوت دیتے اور یہ سمجھتے کہ یہ لوگ ہمارا بگاڑ ہی کیا سکتے ہیں۔ یہ تو عوام کالانعام ہیں۔ خود ہی چپ ہو کر بیٹھ رہیں گے ہمیں خوددار رہنا چاہیئے دنیا کچھ ہی کہے مگر ہم اپنی خودداری کو داغدار نہ ہونے دینگے۔ مگر دیکھو ان مومنین قانتین کو جماعت کی ناراضگی نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ جمہور کی مخالفت نے انپر کس طرح زمین تنگ کر دی۔ اور انہیں اس تنگی اس مصیبت، اس ابتلاء کا کتنا شدید احساس ہوا اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جماعت کیا چیز ہے جمہور کی آواز کی قدر و قیمت کیا ہے اور ان سے کٹ کر الگ ہو بیٹھنا اور اپنے آپکو خوددار اور عالی حوصلہ تصور کرنا کتنی بڑی غلطی، کتنا بڑا جرم اور کس درجہ گستاخی ہے۔

کاش! وہ لوگ جو جمہور کی طرف سے اسقدر غافل ہیں جو زبان پر مہر سکوت لگائے رکھنا اپنا کمال سمجھتے ہیں جو جھوڑنے اور بیدار کرنے کے بعد بھی متوجہ نہیں ہوتے وہ اس واقعہ سے سبق حاصل کریں اور اپنی غلط خودداری اور بے معنے استقامت سے قوم و جماعت کو نقصان نہ پہونچائیں کہ:۔

یدُ اللہ علی الجماعۃ کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے۔

فھل من مدکر؟

ایک ضروری تصحیح

دسمبر کے پرچہ میں صفحہ نمبر ۲ پر میلادِ آدم کے عنوان سے جو نظمیں شائع ہوئی ہیں ان میں حضرت مولانا اسلم صاحب مدظلہٗ کی نظم کے چھٹے شعر کے پہلے مصرعہ میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے۔ قارئین کرام اس کی یوں تصحیح فرمالیں۔

مسکرا کر یہ ملائک سے کہا ابلیس نے

ہم کتابت کی اس غلطی کے لیے حضرت مولانا سے معذرت خواہ ہیں۔

تفسیر اسرار خودی مبحث ششم (مسلسل)

(از خان محمد سلیم خاں چشتی)

نباتات، اطاعت کا سبق پڑھنا چھوڑ دے، تو صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائے۔ یہی حال حیوان اور انسان کا ہے، قانون قدرت ہے کہ جب پیاس لگے تو پانی پیا جائے، جو ذی روح اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا، سزا پائے گا، بچ نہیں سکتا۔

الغرض کائنات میں ساری ترقی، پابندیٔ آئین پر موقوف ہے اب علامہ کے اشعار دیکھئے

هرکه تسخیر مه و پروین کند ✦ خویش را زنجیری آئین کند
باد را زندان گل خوشبو کند ✦ قید، بو را نافہ آہو کند
می زند اختر سوی منزل قدم ✦ پیش آئینے سر تسلیم خم
قطره ها دریاست از آئین وصل ✦ ذره ها صحرا ست از آئین وصل
باطن هر شے ز آئینے قوی ✦ تو چرا غافل ازیں ساماں روی

لہذا جب یہ حقیقت مسلّم ہے کہ اطاعت ہی سے حکومت اور اختیار حاصل ہو سکتا ہے اور آئین کی پابندی ہی سے سروری اور سرفرازی نصیب ہو سکتی ہے تو پھر مسلمان کا فرض بالکل عیاں ہے کہ وہ آئین خداوندی کا پابند ہو جائے اور آنحضرت صلعم کے تلقین کردہ راستے سے سر مو انحراف نہ کرے۔

تبصرہ: تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن مجید کے احکام پر بلا چون و چرا عمل کیا، وہ دنیا میں سربلند رہے، لیکن جب سے انھوں نے منشائے الٰہیہ میں تاویل شروع کر دی، اور قرآن مجید کے صریح احکام کو کھینچ تان کر اپنی منشا کے مطابق کرنے لگے، اسی وقت سے انکا زوال شروع ہو گیا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو تاتاریوں نے تباہ کیا۔

فرنگیوں نے بلکہ اسی تاویل نے ۔

اسی لیے مرشد رومؒ نے ان کو متنبہ کیا ہے

می کنی تاویل حرفِ بکر را ۔ خویش را تاویل کن نے ذکر کیا

اور ہمارے زمانہ میں مولانائے رومؒ کے معنوی شاگرد نے، استاد کی نصیحت کو ان الفاظ میں پیش کیا ۔

حکم دشوار است تاویلے مجو ۔ جز بقلب خویش قندیلے مجو ۔

حاصل کلام یہ کہ اگر مسلمان پھر زندہ ہونا چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے آئین الٰہی کا جوا اپنی گردن پر رکھ لینا چاہیئے اور احکام الٰہی کی بلاچون وچرا تعمیل کرنی واجب ہے۔

شکوہ سنج سختیِ آئیں مشو ۔

از حدودِ مصطفےٰ بیروں مشو ۔

مرحلۂ دوم

تربیت خودی کا دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مرحلۂ اطاعت کا منطقی نتیجہ ہے یعنی ضبطِ نفس صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے انسان کے اندر اطاعت کا مادہ پیدا ہو جائے جب ایک انسان آئین الٰہیہ کی اطاعت کا خوگر ہو جائیگا تو اسکے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنے نفس کو اطاعت کا درس دے سکے ۔

ماہیت نفس

نفس انسانی جس کی غیر تربیت یافتہ حالت کا نام نفس امارہ ہے، بالطبع خود پرور، خودپسند، خودبین اور خودسر ہے اسلیئے انسان کا فرض ہے کہ وہ اسپر اقتدار اور غلبۂ تام حاصل کرے ۔

ضبطِ نفس نہ کرنے کا نتیجہ

جو شخص اپنے نفس پر حکومت نہیں کرسکتا لازمی ہے کہ اسکے علاوہ دوسری طاقتیں اسکے

نفس پر حکمراں ہو جائیں گی۔ مثلاً زید کا نفس دولت کا آرزومند ہے اب اگر وہ اپنے نفس کو اس آرزو کے حصول سے باز نہیں رکھ سکتا۔ تو رفتہ رفتہ حرص و طمع کا جذبہ اُسپر مسلّط ہو جائیگا اور وہ ان خواہشات کا غلام بنجائیگا اسکے علاوہ جب وہ اس آرزو کے حصول کیخاطر دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کریگا تو وہ لوگ بھی اسکے حاکم بنجائینگے اور وہ نفس کی خواہشات کی بدولت، ان لوگوں کا بھی غلام بنجائیگا۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں　　　می شود فرماں پذیر از دیگراں

ترکیبِ سرشتِ انسانی

نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان کی فطرت دو چیزوں سے مرکب ہے خوف اور محبت

خوفِ دنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں　　　خوفِ آلامِ زمین و آسماں
حبِّ مال و دولت و حبِّ وطن　　　حبِّ خویش و اقربا و حبِّ زن

محبت اور خوف پر غالب آنے کا طریق

نفسِ انسانی کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوا کہ دو جذبات اسپر مسلّط ہیں یا تو وہ بعض چیزوں سے خوف کھاتا ہے یا بعض چیزوں سے محبّت اور دنیاوی چیزوں سے خوف اور محبت یہی دو باتیں انسانی ترقی میں حائل ہیں اسلئے علامہ نے ان دونوں پر غالب آنے کا طریقہ بتایا ہے

تا عصائے لا الٰہ داری بدست ٭　　　ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست ٭

یعنی توحید کا عصا ہاتھ میں لے کر اس کی مدد سے مسلمان خوف کے سارے طلسموں کو آنِ واحد میں توڑ سکتا ہے۔ اور اسی کلمۂ توحید پر عامل ہونے سے فرزند و زن اور مال و دولت کی محبت سے رہائی مل سکتی ہے۔

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد ٭　　　فارغ از بندِ زن و اولاد شد

تشریح

اگر مسلمان صدقِ دل سے اس بات پر ایمان لے آئے کہ خدا کے علاوہ اور کوئی

طاقت اُسے نفع یا نقصان نہیں پہونچا سکتی تو پھر وہ دُنیا میں کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتا

جنگ قادسیہ سے پہلے جب ایرانی فوج کے سپہ سالار نے مسلمان سُفرا کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا تو وہ اس شان استغنا کے ساتھ بھرے دربار میں رستم کے سامنے آئے تھے کہ خود دیکھنے والوں پر اُن کی ہیبت کا سکہ جم گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ان میں یہ شان کس وجہ سے پیدا ہو گئی تھی؟ محض اس وجہ سے کہ انکے دل میں غیر اللہ کا خوف مطلق باقی نہیں رہا تھا۔

خوف را در سینۂ او راہ نیست خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

اسی طرح اگر مسلمان ماسوا سے اپنا رشتہ قطع کر کے صرف خدائے واحد سے پیمانِ محبت استوار کرے تو پھر کسی چیز کی محبت اُس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی، وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں نہ بیٹے کی پرواہ کرے گا۔ نہ بیوی کی۔

می کند از ماسوی قطع نظر می نہد ساطور بر حلقِ پسر

حضرت ابراہیمؑ نے بلا تامل اپنے بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دی تھی۔ کیا انہیں اپنے بیٹے سے محبت نہ تھی؟ ضرور تھی مگر اُن کی محبت اولاد، محبتِ الٰہی کے تابع تھی۔ بیٹا بے شک ایک عزیز متاع ہے۔ لیکن حکم خدا کے سامنے اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اپنی جان، انسان کو سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے لیکن موحد وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کرے۔

با یکے مثل ہجوم لشکر است جاں بچشم او ز باد ارزاں تر است

جب لوگوں نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے جسم پر زخموں کے نشانات شمار کئے تو شمار سے بھی زیادہ تھے، کس چیز نے اُن کو اس قدر زخم کھانے کی طاقت بخشی تھی؟ صرف اس بات نے کہ خدا تعالیٰ کا حکم جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن حنبلؒ نے جو صعوبات برداشت کیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں، کس بات نے ان کو اسقدر دلیر بنا دیا تھا؟ سنئے۔

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش ٭ خم نگردد پیش باطل گردنش ٭

ارکان اسلام!

عقیدۂ توحید کے بعد اسلام نے چار ارکان مقرر فرمائے ہیں، ان سب کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان کے اندر ضبط نفس کی طاقت پیدا ہو جائے۔

نماز لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز قلب مسلم را حج اصغر نماز
در کف مسلم مثال خنجر است قاتل فحشاء و بغی منکر است ٭

روزہ روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند خیبر تن پروری را بشکند

حج مومناں را فطرت افروز است حج ہجرت آموز و وطن سوز است حج

زکوٰۃ حب دولت را فنا سازد زکوٰۃ ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

الغرض ارکان خمسہ توحید، صلوٰۃ، روزہ، زکوٰۃ اور حج، خدا تعالیٰ نے اسی لیے فرض قرار دیے ہیں کہ ان کی مدد سے مسلمان اپنے نفس پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔

ایں ہمہ اسباب استحکام تست پختہ ؟ محکم اگر اسلام تست

مرحلۂ سوم

جب ایک مسلمان دونوں مراحل سے گزر جائیگا تو پھر وہ نیابت الٰہی کے مرتبہ پر فائز ہوجائیگا

صفت نائب حق

نائب حق کون اور کیا ہوتا ہے اسکے متعلق علامہ نے حسب ذیل حقائق کا اظہار فرمایا ہے

نائب حق ہمچو جان عالم است ہستی او ظل اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگہ بود در جہاں قایم بامر اللہ بود ٭
پختہ سازد فطرت ہر خام را از حرم بیروں کند اصنام را
نوع انساں را بشیر و ہم نذیر ٭ ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

ذات او توجیہ ذاتِ عالم است | از جلال او نجاتِ عالم است
زندگی را می کند تفسیرِ نو | می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

یعنی نائبِ حق رُوحِ عالم کی مانند ہوتا ہے، اُسکی ذات سے دُنیا زندگی حاصل کرتی ہے یعنی دُنیا کے لوگ روحانی زندگی پاتے ہیں اور اُس کی ہستی اسمِ اعظم کا ظل یا پرتو ہوتی ہے یعنی اسکی ذات میں خدا کی صفات کا رنگ جھلکتا ہے وہ نظامِ عالم کے اسرار اور رموز سے آگاہ ہوتا ہے اور دنیا میں خدا کے حکم سے قایم ہوتا ہے اس کی صحبت کے فیض سے خام طبع لوگ مراتبِ عالیہ پر پہنچ جاتے ہیں اور وہ اپنی روحانی قوت سے لوگوں کو توحید کے مقام پر پہنچا دیتا ہے یعنی لوگوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنا دیتا ہے۔ گمراہوں کو راہ راست دکھاتا ہے اور لوگوں کو زندگی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کرتا ہے۔

اس کے بعد علاّمہ اس امر کی آرزو کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں اس شان کا کوئی شخص دُنیائے اسلام میں پیدا ہو جو مسلمانوں کو دوبارہ اخوت کا سبق پڑھائے، اور ان میں الفت و محبت کا بیج بوئے، اور دُنیا میں امن قایم کرے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا | اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
شورشِ اقوام را خاموش کن | نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن!
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ | جامِ صہبائے محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایّامِ صلح! | جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح!

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

تقریظ و تبصرہ

ارمغانِ حجاز

علامہ اقبال مرحوم کے آخری اشعار کا مجموعہ جو اُنکے انتقال کے بعد اب حال میں شائع ہوا ہے۔ مندرجۂ بالا نام سے موسوم کیا گیا ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ علامہ موصوف ادھر دو تین سال سے حج کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر علالت کیوجہ سے سفر کی صعوبت برداشت کرنے کے قابل نہ تھے اسی غلبۂ شوق میں انھوں نے اپنے آپکو روحانی طور پہ اللہ اور رسول کے درباروں میں پہونچا کر اپنی آرزوئیں اور التجاؤں کو اشعار میں بیان کردیا جو اس مجموعہ کے آغاز میں رکھ دی گئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسکا نام ارمغانِ حجاز رکھا گیا۔ حضورِ حق میں دورِ حاضر کے مسلمانوں کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد   کہ جبریلِ امیں را دل خراشد

چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا   پرستد مومن و کافر تراشد

ز محکومی مسلماں خود فروش است   گرفتارِ طلسمِ چشم و گوش است

ز محکومی رگاں در تن چناں سست   کہ ما را شرع و آئیں بارِ دوش است

دربارِ رسالت میں پہونچکر وجد و بے تابی اور گریۂ شوق کے بعد ہندی مسلمانوں کا حال بیان کرتے ہیں۔

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست   بایں خاک آفتابے راگزر نیست

بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق   مسلمانے ز ما بیچارہ تر نیست

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے   مسلمانے بگوہر ارجمندے

خدا ایں سخت جاں را یار بادا   کہ افتاد است از بامِ بلندے

عروسِ زندگی در خلوتش غیر   کہ دارد در مقامِ نیستی سیر

گنہگاریست بیش از مرگ در قبر   نکیرش از کلیسا منکر از دیر

مپرس از من کہ احوالش چہ سان است
زمینش بدگہر چون آسمان است

بر آں مرغے کہ پروردی بہ انجیر
تلاش دانہ در صحرا گران است

اپنی بابت فرماتے ہیں کہ میں نے کیا کیا:۔

حضور ملت بیضا تپیدم
نوائے دلگدازے آفریدم

ادب گوید سخن را مختصر گوے
تپیدم۔ آفریدم۔ آرمیدم۔

درخواست یہ ہے کہ:۔

بدہ دستے ز پا افتادگان را
بہ غیر اللہ دل ناد ادگان را

ازاں آتش کہ بر جان من افروخت
نصیبے دہ مسلمان زادگان را

حجاز کے سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:۔

ز افرنگی صنم بیگانہ تر شو
کہ پیمانش نمی ارزد بیک جو

نگاہے وام کن از چشم فاروق
قدم بیباک نہ در عالم نو

اسکے بعد ملت سے کہتے ہیں۔

بمنزل کوش مانند مہ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رو

صوفیوں اور ملاؤں نے قرآنی ہدایت کو کسقدر مسخ کر ڈالا ہے سنیئے۔

ز من بر صوفی و ملا سلامے
کہ پیغام خدا گفتند ما را

ولے تاویل شاں در حیرت انداخت
خدا و جبریل و مصطفیٰ را

نوجوان سلطان فاروق کو جس کی خلافت کی آرزو مصریوں کے دلوں میں ہے ہدایت کرتے ہیں۔

جہانگیری بخاک ما سرشتند
امامت در جبین ما نوشتند

درون خویش بنگر آں جہاں را
کہ تخمش در دل فاروق کشتند

خلافت اور ملوکیت کا فرق واضح کرتے ہیں۔

خلافت بر مقامِ ما گواہی است حرام است آنچہ بر ما پادشاہیست
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ خلافت حفظ ناموسِ الٰہی است

آخر میں یارانِ طریقت کو یہ مختصر نکتہ سکھاتے ہیں :-

قلندر میل تقریرے ندارد بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد
ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست کہ آب از خونِ شبیرے ندارد

ڈاکٹر اقبال مرحوم پیغامی شاعر تھے، انہوں نے دعوے بھی کیا ہے۔

بخامہ کہ خطِ زندگی رقم زدہ است نوشتہ اند پیامے بہ برگ نرگسم

بعض بعض جگہ اپنے پیغام کی تشریح بھی کی ہے۔ اس ارمغان میں فرماتے ہیں۔

نخستیں لالۂ صبح بہارم + پیالے سوزم از داغیکہ دارم
بچشم کم مبیں تنہائیم را کہ من صد کاروان اندر کنارم

اُن کو یقین ہے کہ میری کوشش رائگاں نہیں جائیگی۔ بلکہ جو کچھ میں نے قولاً ظاہر کیا ہے وہ اسکو عملاً کر دکھانیوالے کی تصویر ہے جو اسکے پیچھے آرہا ہے۔

بہ بحرِ خویش چوں موجے تپیدم تپیدم تا بطوفانے رسیدم +
دگر رنگے ازیں خوشتر ندیدم + بخونِ خویش تصویرش کشیدم

دل اندر سینہ گوید دلبرے ہست متاعِ آفریں غارتگرے ہست
بگوشم آمد از گردوں دمِ مرگ شگوفہ چیں فرو ریزد برے ہست

فارسی کلام ۱۰۱ صفحہ پر ختم ہوجاتا ہے۔ اسکے بعد اُردو نظمیں ہیں جنکا آغاز ابلیس کی مجلس شوریٰ سے ہوتا ہے وہ فخر و ناز سے کہتا ہے کہ دُنیا میں جس کام کے لیے میں آیا تھا۔ اسکو مکمل کرچکا۔ یہانتک کہ :-

اسکی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز جسنے اسکا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نون
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں

ایک مشیر ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اسکی مدح سرائی کرتا ہے کہ بے شک تو نے مشرقی رہنماؤں کو قلب و

دماغ ہر لحاظ سے غلامی میں طاق کر دیا۔

طبعِ مشرق کیلئے موزوں یہی افیون تھی ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

دوسرا مشیر کہتا ہے کہ یہ جمہوریت جو دنیا میں پھیل رہی ہے ہمارے لیے فتنہ نہیں ہے؟

پہلا مشیر جواب دیتا ہے کہ یہ جمہوریت نہیں ہے۔ بلکہ ملوکیت اور استبداد کو چھپانے کے لیے پردہ ہے۔ تیسرا مشیر بولا کہ اس یہودی (کرل مارکس) کی شرارت کا کیا جواب ہے جس نے مزدوروں اور غلاموں کو اکسا کر سرمایہ داروں اور آقاؤں کو ختم کرا دیا۔ چوتھے مشیر نے کہا کہ اسکا تو ڑ فسطائیت ہے جو رومۃ الکبریٰ سے نکلی ہے۔ تیسرے نے کہا کہ واہ۔ اُسنے تو اس پردہ کو بھی اُٹھا دیا جو ہم نے فرنگی استبداد پر ڈال رکھا تھا۔ اسلیئے وہ ہمارے حق میں اور بھی مضر ثابت ہوئی۔ پانچویں نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ مزدکی روح کی بیداری ہمارے لیے فتنہ سامانی ہے۔ اب وہ پرانا گھاگ ابلیس خود جواب دیتا ہے کہ مزدکیت تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اُس سے کیا خطرہ لیکن :-

ہے اگر مجھکو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے جسکی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ کرتے ہیں اشکِ گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

لہٰذا جہانتک ہو سکے مسلمانوں کی آنکھ پر پردہ ڈالے رکھو تاکہ وہ قرآنی اسرار و رموز سے باخبر نہ ہونے پائیں۔ اور روحانی اور جسمانی ہر قسم کی غلامی میں مبتلا رہیں۔

یہ نظم درحقیقت مسلمانوں کے لیئے زمانۂ حاضر میں ایسا مفید سبق ہے کہ اس سے وہ اپنی خودی اور ہستی اور نیز ابلیس کے اُن گرگوں اور چیلوں کو اچھی طرح پہچان سکتے ہیں جنہوں نے اُنکو قرآن سے دُور رکھ چھوڑا ہے اور ایسی انسانی تعلیموں میں پھنسا رکھا ہے جو غلامی پر قانع بنائے ہوئے ہیں۔

اسکے بعد اُردو کی چند نظمیں اور ہیں اور پھر ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کی بیاض۔ پوری کتاب ۲۸۰ صفحات پر ختم ہو جاتی ہے اور یہ خیال کرتے ہوئے دل کو دکھ ہوتا ہے کہ اقبالی نظموں کا یہ آخری مجموعہ ہے جسکے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیئے بند ہو گیا۔ کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ قیمت اڑھائی روپے (غیر مجلد)

ملنے کا پتہ :- تاج کمپنی و دیگر اسلامی کتب فروشان۔ لاہور (ادارہ)

ادارۂ معارف اسلامیہ کا تیسرا جلسہ

حضرت علامہ اقبالؒ کی اس تڑپ نے جو احیائے علوم اسلامیہ کے لیے انکے قلب مضطرب میں موجزن رہا کرتی تھی۔ آج سے قریب پانچ برس پیشتر ادارۂ معارف اسلامیہ کی بنا ڈالی جس کا مقصد اسکے نام سے ظاہر ہے۔ اور شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی معارف اسلامیہ سے متعلق والہانہ شیفتگی اس ادارہ کے تیسرے اجلاس کے لیے دہلی کے انتخاب کا موجب بنی۔ چنانچہ ۲۸-۲۷-۲۶ دسمبر کو عربک کالج کے ہال میں اس ادارہ کے اجلاس منعقد ہوئے ان اجتماعات کو اس اعتبار سے کہ ان میں ملت اسلامیہ کے بہترین قلب و دماغ یکجا جمع ہو رہے تھے، اپنے اندر خاص اہمیت رکھنی چاہیے تھی۔ لیکن ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑا کہ وہ نگاہیں جو ایسے اسلامی اجتماعات میں زندگی کے کسی نشان کی متلاشی تھیں اُن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ چاروں طرف پھر پھرا کر بصد حسرت و یاس گوشۂ چشم میں لوٹ کر آجاتی تھیں یقلب الیک البصر خاسئاً وھو حسیر۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم کے سامنے زندگی کا کوئی خاص نصب العین نہ رہے تو اسکے اندر ظواہر و رسوم باقی رہ جاتے ہیں۔ روح نہیں رہتی پہلی بات تو یہی افسوسناک تھی کہ ایک نشست میں اگر دس مقالہ نگار حضرات کے اسمائے گرامی پروگرام میں درج تھے تو ان میں سے مشکل تین چار جلسہ میں تشریف لاتے تھے یہ تو ظاہر ہے کہ پروگرام میں انہی حضرات کے نام دیئے گئے ہونگے جنہوں نے تشریف لانے کا وعدہ فرمالیا ہوگا۔ وعدہ کر لینے کے بعد جلسوں میں تشریف نہ لانا۔ قوم کے قوائے عملیہ کے مضمحل ہونے کی زندہ شہادت ہے۔ پھر ہمارے ان علمائے محققین نے اپنی علمی کاوشوں کے لیے جو موضوعات منتخب فرمائے تھے۔ اُنپر نگاہ ڈالنے سے اور افسوس پیدا ہوتا تھا کہ دنیا کدھر کو جا رہی ہے اور ہمارے محققین کرام کس قسم کی گتھیاں سلجھانے میں منہمک ہیں۔ قوم موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ ہجوم مصائب نے اسپر آخری وقت کی ہچکیاں طاری کر دی ہیں۔ اپنے بیگانے

اُسکے مٹانے کی فکر میں ہیں۔ اور قوم کے بہترین دل و دماغ، دنیا و مافیہا سے بےخبر، اس "جہادِ عظیم" میں مصروف بیکار ہیں کہ دیوان حافظ کا سب سے پُرانا قلمی نسخہ کس کتب خانہ میں ہے اور فلاں مخطوطہ کو دیمک نے کس سن میں چاٹا تھا۔ چنانچہ پروگرام میں اکثر عنوانات اسی قسم کے ملینگے کہ رباعیات ابوسعید کا مصنف کون تھا۔ شہرزوری کی نزہتہ الارواح کا قدیمی نسخہ کہاں ہے۔ محمود دہلوی کے حالات، تاریخ رضا۔ اعتماد الدولہ اور آذر کے کوائفِ حیات، ریختہ کی چند ایسی نظمیں جو حال ہی میں دریافت ہوئی ہیں، فتوحات مکیہ کا ایک قیمتی نسخہ۔ خواجہ بہ حیثیت ایک غزل گو شاعر کے، سرو کشمیر، پنڈت قنوج کی تاریخ وغیرہ وغیرہ۔ ہم اس قسم کی علمی تحقیقات کی تنقیص نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہر بات اپنے اپنے وقت پر موزوں ہوتی ہے۔ اس قسم کی علمی موشگافیاں اس زمانہ کی باتیں ہیں جب قوم تمام امور کیطرف سے فارغ ہو جائے۔ سلطنت اور حکومت اپنی ہو۔ ہر قسم کا اطمینان میسر ہو جس دور سے آج ہندوستان کے مسلمان گزر رہے ہیں اسکا تقاضا ہے کہ:۔

پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

آج تو شاعر کو اپنے شعر سے، عالم کو اپنے علم سے، ادیب کو اپنے ادب سے، مدبر کو اپنی تدابیر سے محقق کو اپنی تحقیقات سے، اس بات کی فکر کرنی چاہیئے کہ جاں بلب مریض کو ہوش کس طرح آئے نہ یہ کہ اسکا شجرہ نسب کس طرح سے مرتب کیا جائے۔ جب اسطرف سے اطمینان حاصل ہو جائے تو پھر ان علمی کاوشوں میں مصروف ہو جائیے۔

آپ مسلمانوں کے قرنِ اولی میں، جو محض عمل کا دور تھا کہیں اس قسم کی نکتہ آفرینیوں کا پتہ نہ پائینگے یہ باتیں عام طور پر عہد عباسیہ میں ملیں گی جبکہ مسلمانوں کو فارغ البالی نصیب تھی۔ آج تو ہمارے علما سے محققین کے سامنے مسائل اس قسم کے ہونے چاہئیں کہ دورِ اوّل کے مسلمانوں نے کس طرح ترقی کی۔ ان کی وحدتِ ملی کس طرح قائم ہوئی۔ مسلمانوں میں تشتت و افتراق کے اسباب کیا تھے۔ اُن کی مرکزیت کن اسباب کے ماتحت فنا ہوئی۔ خلافت ملوکیت میں کیوں بدل گئی۔ صحیح اسلامی تصورات زندگی پر عجمی تکلفات کا پردہ کس طرح پڑا۔ آج وہی دورِ اولی کا اسلام پھر سے کس طرح واپس آ سکتا ہے مسلمانو

کی ہٹی ہوئی عظمت، اُن کی چھنی ہوئی دولت، اُنکی کھوئی ہوئی ثروت، اُن کی غصب شدہ عزت انہیں پھر کیسے مل سکتی ہے۔ ان مسائلِ زندگی کی تحقیقات کیجئے اور پھر ان تحقیقات کے نتائج کو قوم کے سامنے لائیے۔ یہ تو ہوا کچھ کام۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ انڈیا آفس کے مخطوطات، اور تولیج خاں کے مکتوبات سے قوم تباہی سے نہیں بچ سکتی۔ اس دور میں اس قسم کی تحقیقات کے متعلق تو سوائے اسکے اور کیا کہا جائے کہ۔

خواجہ در نقشِ بندِ ایوان ست　　خانہ از پشتِ پائے ویران ست

ہمارے اس نظریہ کے ماتحت ہمیں تمام پروگرام میں ایک موضوع یعنی
"خلافت، اسکا ماضی اور مستقبل"
موزوں نظر آیا۔

لیکن افسوس کہ صاحب مقالہ (ڈاکٹر عبداللطیف صاحب) تشریف ہی نہ لائے اور اس مقالہ کی جگہ خالی رہی۔ اسلامی علوم کی تحقیقات کے متعلق ڈاکٹر زبید احمد صاحب (الہ آباد) کا عنوان "ہندوستان کے تصانیف عربیہ متعلقہ علومِ حدیث"۔ مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کا عنوان "علم حدیث"۔ مولوی سید سعید انصاری کا عنوان "مسلمانوں کا علم جغرافیہ"۔ اور پروفیسر برق صاحب کا عنوان، احمد بن تیمیہ۔ یقیناً مفید تھے ہر چند یہ عنوانات بھی نظری ہیں تاہم ان کے تحقیقاتی نتائج خالی از افادیت نہیں ہیں۔
ان کے علاوہ جناب ڈاکٹر کٹھاری صاحب، جناب ڈاکٹر رام بہاری صاحب کے عنوانات "علوم سائنس میں مسلمانوں کا حصہ" اور "علوم ریاضی میں مسلمانوں کا حصہ" ایسے تھے جن پر مقالہ نگار حضرات مستحق مبارکباد ہیں۔

لیکن ان اجتماعات کے اندر اگر کہیں زندگی کے آثار نظر آتے تھے تو وہ ادارہ کے صدر محترم جناب آنریبل سر شاہ محمد سلیمان صاحب کی ذاتِ گرامی تھی، جناب شاہ صاحب آسمانِ علم و فضیلت کے ایک ایسے درخشندہ آفتاب ہیں جن پر ملتِ اسلامیہ بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ سائنس کی دنیا میں آپکی شہرت محتاجِ تعارف نہیں۔

لیکن ان اجتماعات کے موقع پر ہمیں آپ کی ذات میں جو تابناک جوہر نظر آئے، وہ ان کی اس شہرت سے الگ ہیں پہلی چیز تو یہ کہ ایک ماہر ریاضی اور حکیم فلکیات کو جس قسم کا "عبوساً قمطریرا" ہونا چاہیئے اس کا تصور ہی دماغ کی یبوست کے لیئے کافی ہے لیکن فطرت کی کرم گستری نے جناب شاہ صاحب کو مزاج ایسا شگفتہ۔ اور زبان ایسی پاکیزہ عطا فرمائی ہے کہ وہ نظریہ اضافیت جیسے حار و یابس موضوع کو اس حسین اور دلکش انداز میں بیان فرما گئے۔ گویا حاضرین کو زعفران کے کھیتوں کی سیر کرا رہے ہیں۔

لیکن جس غرض کے لیئے ہم نے علامہ شاہ صاحب کا ذکر چھیڑا ہے وہ ان کے دوسرے جوہر گرانمایہ کا اظہار ہے۔ اور وہ یہ کہ جہاں وہ شکل و صورت کے لحاظ سے یکسر "مغربی" واقع ہوئے ہیں۔ قلب و نظر کے اعتبار سے ہمہ تن "مشرقی" ہیں یعنی فطرت کے کرم بالائے کرم نے ان کے سینہ میں ایمان کی حرارت، نگاہوں میں قرآن کی بصیرت اور ذہن میں حیاتِ اسلامیہ کا ایسا صحیح تصور جاگزیں کیا ہے کہ وہ مغرب کے جھوٹے نگوں کی مینا کاری سے کبھی فریب نہیں کھاسکے ان کا خطبۂ صدارت۔ جسکے دوران میں انہوں نے فرمایا کہ صحیح علم کی تعریف یہ ہے کہ اسکے نتائج ایمان کے تابع رہیں اور ان کا مقالہ "اضافیتِ جدید" جس میں انہوں نے حکمائے یورپ کی قیاس آرائیوں کی نقاب کشائی فرمائی ہے انکے قلب و دماغ کی بلندیوں کے آئینہ دار تھے

ہم ادارہ معارف اسلامیہ کو ان کے اس قابل قدر صدر کے انتخاب پر مستحق تبریک سمجھتے ہیں اور متوقع ہیں کہ انکی صدارت و قیادت میں یہ ادارہ وقت کی نزاکت و اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کی صحیح علمی و عملی خدمات سرانجام دے سکے گا۔ اور اس طرح اس ادارہ کے معمار اولیں۔ حضرت علامہؒ کا وہ نصب العین سامنے آجائے گا جسکے لیئے انہوں نے اس ادارہ کی تشکیل فرمائی تھی کہ:۔

ہے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں ۔۔۔ جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا (اقبالؒ)

لمعات

بہت کم ایسا ہوا ہے کہ ہم نے اپنے متعلق کچھ لکھا ہو لیکن بعض اوقات جماعتی ضرورتوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایسا بھی کیا جائے۔ جو احباب شروع سے ہمارے ساتھ چل رہے ہیں انہیں تو معلوم ہے لیکن جو حضرات ہمارے اس سفر میں کچھ دور آگے جا کر ہم سے ملے ہیں انہیں معلوم نہیں کہ اس بے سروسامان قافلہ کا پہلا قدم کن حالات کے ماتحت اٹھا تھا۔ ذرا تصور میں لائیے ایک ایسی حالت کو کہ آپ ایک شب تیرہ و تار میں آبادی سے دور ایک ویرانے میں کھڑے ہوں۔ دور دور تک نہ کہیں کسی روشنی کے آثار نظر آئیں۔ نہ کسی انسان کی آواز سنائی دے۔ آسمان کے تاروں تک کو ظلمت انگیز گھٹاؤں نے ڈھانپ رکھا ہو۔ ایک وحشت ناک عفریت جھکڑ دور کے درختوں سے چیخنے کی ایسی بھیانک آوازیں پیدا کر رہا ہو کہ گویا سامنے کے اجڑے ہوئے مرگھٹ میں خبیث روحیں بین کر رہی ہیں۔ اس لرزہ انگیز خوف اور وحشت اور اس زہرہ گداز یاس و حسرت کے ماحول میں آپ کے پاس صرف ایک ٹمٹماتا سا مٹی کا دیا ہو، جسے آپ اس جھکڑ اور آندھی کے بے پناہ مہیب حملوں سے بچانے کی خاطر یوں تہ آستیں چھپائے ہوں۔ جیسے کسی برفانی رات میں ایک غریب بیوہ اپنی امیدوں کے آخری سہارے۔ ایک ننھے سے بچے کو چیتھڑوں میں لپیٹے چھاتی سے لگائے کھڑی کانپ رہی ہو۔ عزم راسخ۔ شوق منزل۔ پاکیزگی مقصد۔ جرأت قلب اور توکل علی اللہ کا یہ دیا تھا جو کائنات اہل جنوں کے اس کارواں کی جو ہمہ تن اضطراب بنکر محمل لیلیٰ کی تلاش میں یوں چل نکلا تھا کہ آسمان اسکی دیوانگی پہ خندہ زن اور زمین اسکی جرأت پہ قہقہہ انداز تھی۔ اس رہزن امید و حوصلہ اور دشمن عزم و استقلال ماحول میں ایک دور کی آواز تھی، جو صدائے ربانی بنکر پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ مت گھبراؤ۔ ہرگز خوف نہ کھاؤ۔ ہر چند تمہارے چراغ کی روشنی دو قدم تک ہی راستہ دکھا سکتی ہے۔ لیکن اس چراغ کو سامنے رکھو اور قدم بڑھاتے جاؤ تم دیکھو گے

کہ تمام راستہ خودبخود روشن ہوتا جائیگا۔ اِس ہمت افزا آواز نے حوصلہ بندھایا۔ اور اِس کاررواں شوق نے آگے قدم بڑھایا۔ آپ حیران ہونگے کہ اِن آٹھ منزلوں میں جو طلوعِ اسلام نے اسوقت تک طے کی ہیں۔ اِس "دُور" کی آواز کا ایک ایک حرف سچا ثابت ہوا۔ اللہ کے مخلص بندوں کی یہ جماعت جسنے اِس کوہِ گراں کو اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا، نہ اُنکے قدموں میں کہیں لغزش محسوس ہوئی اور نہ اُن کی پیشانی پر کبھی بل نظر آیا۔ اور بوجھ جتنا زیادہ بڑھتا گیا اُنکے چہرے عزم کی بلندی اور قلب کے اطمینان سے اور تمتماتے گئے۔ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ۳/۱۷۳

وہ لوگ کہ جب ان سے کہا کہ تمہارے خلاف تو بڑی شدومد سے اجتماع ہو رہے ہیں تو اِس خبر نے اُنکے ایمانوں کو اور زیادہ کر دیا۔ اور انہوں نے مسکراتے ہوئے کہہ دیا کہ ــــ خدا دارم چہ غم دارم

آپکو یہ تو معلوم ہے کہ طلوعِ اسلام کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ یہ اُمتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اور اسکے تمام خسارہ کی ذمہ دار وہ جماعت ہے جسکا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ جو اپنے اللہ سے عہد کر چکی ہے کہ جب تک مشیتِ ایزدی کو منظور ہے اسے زندہ رکھے گی۔ اور نہ صرف زندہ۔ بلکہ اُسکا ہر ایک قدم آگے ہی بڑھے گا۔ اور اگر اِس میں کبھی کچھ مُنافع ہوا تو اسمیں سے ایک حبہ بھی اپنے لیے جائز نہیں سمجھا جائیگا۔ اِس قسم کی "تجارت" کی مثالیں سوائے بازارِ محبت کے اور کہاں مل سکتی ہیں۔ خسارے کی شکل یوں ہے کہ پرچہ کا نظام یہ ہے کہ جتنے خریدار ہوں، اتنے ہی بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ پرچے ایسے مقامات پر مفت پہنچائے جاتے ہیں، جہاں اِس پیغام کا پہونچانا ضروری ہے۔ لیکن جو ابھی اسکو قیمت دے کر خریدنا نہیں چاہتے۔ یا خرید نہیں سکتے۔ مثلاً مختلف اسلامی درسگاہیں، بالخصوص کالجوں کے نوجوان طلبا، کتب خانے۔ دار المطالعہ۔ مسلم قومیت پرست حضرات۔ قومی ادارے وغیرہ۔ اِس نظام کو پورا کرنے میں یہ جماعت بعونہٖ تعالےٰ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کریگی جو حضرات اسکی شرکت مستحسن سمجھتے ہیں وہ اِس جماعت کے اراکین کے زمرہ میں شامل ہو جاتے

ہیں۔ اور یوں کونوا مع الصّادقین کی عملی تفسیر پیش کر دیتے ہیں ۔

لیکن رسالہ سے کہیں زیادہ وسیع اور ضروری شعبہ ایک اور ہے۔ جسکا ابتدا میں کچھ ایسا خیال بھی نہ تھا۔ اِس پیغام کو عام کرنے کے لیے یہ سوچا گیا کہ رسالہ کے اہم مضامین کو پمفلٹوں کی شکل میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ اسوقت تک علاوہ اسلامی معاشرت کے گفتگوئے مصالحت بسوراجی اسلام۔ وارد ھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان ۔ زبان کا مسئلہ اور اِس پر چکا اہم ترین مضمون۔ متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب، الگ پمفلٹوں کی صورتیں شائع ہو چکے ہیں اُن کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک وارد ھا اسکیم والا پمفلٹ دس ہزار کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے اور امسال ہی میں اسکا چوتھا اڈیشن اور چھپا ہے یہ تعداد صرف اُردو کے پمفلٹ کی ہے۔ اسکے پشتو اور گجراتی کے تراجم الگ شائع ہوئے ہیں۔ اب سندھی میں ترجمہ کا انتظام ہو رہا ہے اور اسکے بعد غالبًا بنگالی میں۔ یہ پمفلٹ قریب قریب لاگت پر فروخت کیے جاتے ہیں۔ اِن پمفلٹوں کی اشاعت سے ملک میں کس قدر ذہنی انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ اِس کا اندازہ ہم ان سینکڑوں خطوط سے لگا رہے ہیں جو دُور دراز گوشوں سے ہمیں موصول ہو رہے ہیں۔ لیکن انہی خطوط میں ایک چیز ہمیں ایسی بھی ملتی ہے جسے ہم آجتک دل پر جبر کر کے روکے رہے ہیں لیکن اب جس کا اظہار ضروری سمجھا گیا ہے۔ متعدد مقامات سے لکھا آتا ہے کہ اس علاقہ میں فلاں فلاں پمفلٹ کی اشاعت کی سخت ضرورت ہے لیکن یہاں نہ کوئی منظم جماعت ہے نہ کوئی بیدار ادارہ جو ان کو خرید کر تقسیم کر سکے۔ اِسلیئے یہاں پمفلٹ مفت تقسیم کرنے کے لیے بھیجے جائیں۔ ہم حالات کی نزاکت، اور رفتارِ زمانہ کی اہمیت کے ماتحت ایسے مطالبات کو رد نہیں کر سکتے لیکن جب اپنے جیب و داماں کی وسعت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو انہیں پورا کرنیکی بھی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔ اسوقت تک اسکا بار بھی طلوع اسلام ہی برداشت کرتا رہا لیکن اب یہ مطالبات اتنے بڑھتے جا رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام کے محدود ذرائع آمدنی انہیں پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ اب

دو ہی شکلیں ہیں۔ یا تو ہم ان مطالبات کو رد کرنا شروع کردیں، یا آپ حضرات اشتراکِ عمل کے خواہاں ہوں۔ قبل اسکے کہ ہم مطالبات کے رد کرنیکا فیصلہ کریں۔ ہم نے ضروری سمجھا کہ اس اہم مسئلہ کو آپ حضرات کے سامنے بھی پیش کردیں، تاکہ ان احباب کو جو تعاونوا علی البرّ والتقویٰ کے ماتحت اسمیں شرکت کے آرزومند ہوں، اسکا موقع مل سکے۔ تعاون کی شکل کچھ ایسی ہو سکتی ہے کہ:-

(۱) آپ کچھ پمفلٹ خرید کر اپنے اپنے علاقہ میں مفت تقسیم کرادیا کریں۔

(۲) اگر خود تقسیم نہ کرنا چاہیں تو ہمیں لکھ دیا کریں کہ فلاں فلاں پمفلٹ اتنی تعداد میں آپکی طرف سے فلاں علاقہ میں تقسیم کرادیا جائے۔

(۳) یا کوئی رقم اس مد میں ارسال کردیں تاکہ اس سے ان مطالبات کو پورا کرنے میں مدد مل سکے۔

واضح رہے کہ اس مد کا تمام حساب طلوع اسلام سے بالکل الگ رہیگا کیونکہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے طلوع اسلام، اپنی جماعت سے باہر کبھی کسی شخص سے ایک پیسہ کے لیے بھی درخواست نہیں کریگا۔ البتہ طلوع اسلام کی امداد آپ اسکی اشاعت بڑھانے سے کرسکتے ہیں بشرطیکہ آپ ہم سے متفق ہوں کہ اسکی اشاعت کا زیادہ ہونا ضروری ہے نیز اس بات کو بھی ذہن میں رکھیں کہ طلوع اسلام کے ہر نئے خریدار کے ساتھ ایک پرچہ نہایت ضروری مقام کے لیے مفت جاری ہو جاتا ہے۔

اس پرچہ میں متحدہ قومیت کے متعلق جناب رازی کا ایک نہایت اہم اور بصیرت افروز مضمون شائع ہو رہا ہے۔ سیاستِ حاضرہ میں یہ موضوع کس قدر اہمیت اپنے اندر رکھتا ہے اسکے متعلق کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے نہ ہی اس امر کے اظہار کی ضرورت ہے کہ جنابِ رازی مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں کس حسن و خوبی سے حل کرتے ہیں۔ مضمون کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اُسے ایک ہی قسط میں شائع کیا جائے جسکی وجہ سے دیگر مضامین کو روک لینا پڑا ہے۔ یہ مضمون الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو رہا ہے ضرورت ہے کہ اسے ملک میں عام تقسیم کیا جائے۔ ضخامت کی وجہ سے قیمت ۲ر فی پمفلٹ